حیدرآباد فرخندہ بنیاد سے شائع ہونے والا قدیم متوازن علمی وادبی ماہنامہ

سب رس

اگست 2018ء

-/30 روپے

UGC'S Approved Urdu Journal-S.No.41103

ISSN 2278-6902

ادارۂ ادبیات اردو حیدرآباد

جناب انجنی کمار، کمشنر پولیس حیدرآباد نے حج ہاؤز میں 12 ویں قافلہ کو جھنڈی دکھا کر رخصت کیا۔ پروفیسر ایس۔ اے۔ شکور،
اسپیشل آفیسر، تلنگانہ حج کمیٹی، محمد سلیم، صدر نشین تلنگانہ وقف بورڈ، محمد مسیح اللہ خاں، صدر نشین حج کمیٹی دیکھے جاسکتے ہیں۔

راج بہادر گوڑ صدی تقاریب کے افتتاحی جلسے میں پروفیسر بیگ احساس صدارتی تقریر کرتے ہوئے۔
(دائیں سے بائیں) جناب عزیز پاشاہ، جناب راجندر راجن، جناب این نرسمہا ریڈی، وزیر داخلہ، ریاست تلنگانہ،
جناب زاہد علی خاں (ایڈیٹر سیاست)، جناب احمد عالم خاں اور جناب غلام یزدانی، سینئر ایڈوکیٹ۔

بیادگار سید محی الدین قادری زورؔ

ماہنامہ

سب رس

حیدرآباد

جلد: ۸۰ شمارہ: ۸ ماہ: اگست سال: ۲۰۱۸ء

مجلس ادارت

❁ سرپرست: راجکماری اندرادیوی دھن راج گیرجی

❁ صدر: جناب زاہد علی خاں

❁ معتمد عمومی: پروفیسر ایس۔اے۔شکور

مجلس مشاورت

❁ پروفیسر گوپی چند نارنگ

❁ جناب مجتبیٰ حسین

❁ پروفیسر اشرف رفیع

مدیر

پروفیسر بیگ احساس

قیمت: -/30

زرِ سالانہ

❁ ہندوستان: **300** روپے

❁ پاکستان و بنگلہ دیش: 600 روپے

❁ کتب خانوں سے: **400** روپے

❁ مغربی و عرب ممالک سے 60 ڈالر یا 40 پاؤنڈ

Phone: 040-23313311 **Editor: 9849256723** Fax: 040-23374448

مراسلت و ترسیل زر کا پتہ: ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد 500 082. انڈیا

برقی پتہ: *E-mail: idarasabras@yahoo.in*

چیک یا ڈرافٹ: **The Sabras Monthly, Hyderabad** کے نام سے ارسال کریں۔

بیرون حیدرآباد چیک کلیرنگ چارجس -/60 روپے زیادہ

رسالے کی عدم دستیابی سے متعلق شکایت فون نمبر: 9949303546 / 9032566731 پر کیجیے۔

پرنٹر و پبلشر پروفیسر ایس۔اے۔شکور نے طہٰ پرنٹ سسٹمس لکڑی کا پل میں طبع کرواکے ادارۂ ادبیات اردو سے شائع کیا۔

کلونجی

خواتین کیلئے قیمتی تحفہ

زیادہ سے زیادہ خواتین ہمارے بیوٹی پروڈکٹس کی منفرد کوالٹی کو محسوس کر رہی ہیں۔

آپ کی بہتر سے بہتر انداز میں خدمت پر ہمیں فخر ہے۔

آپ کے حسن کیلئے اس سے بہتر کچھ نہیں۔

خواتین کا
من پسند اور
آزمودہ نسخہ

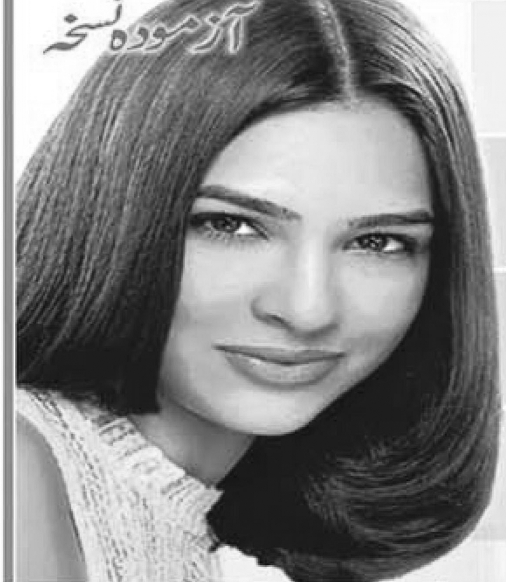

زم زم بہار ہیئر آئیل
• بالوں کا جھڑنا روکتا ہے۔ • سر میں بفا دور کرتا ہے۔ • بالوں میں تازگی پیدا کرتا ہے۔ • بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ • بالوں کی جملہ شکایات کیلئے مفید ہے۔ • سر درد دماغی سکون کے علاوہ چین کی نیند کیلئے مفید ہے۔

کلونجی فیرنس کریم
- چہرے سے داغ دھبے دور کرتا ہے۔
- جھائیوں اور زائد تیل کو نکالتا ہے۔
- چہرے کی جلد کی رنگت کو گورا ملائم اور خوبصورت بناتا ہے۔

کلونجی پمپل کریم
• چہرے کے کیل مہاسے • باریک داغ • چہرے کے جملہ داغ مٹاتا ہے • چہرے پر پیدا ہونے والی جھریوں کو ختم کرتا ہے • آنکھوں کے نیچے کالے حلقوں کو دور کرتا ہے۔

کلونجی ہربل ٹوتھ پاوڈر
دانتوں کے جملہ امراض، دانت کا ہلنا، دانت میں تکلیف، دانت کا کیڑ، منہ سے بدبو آنا وغیرہ میں نہایت مفید ہے

آپ بھی آزما کر دیکھئے

ہمارے دیگر پراڈکٹس

- کلونجی تیل
- کلونجی مساج آئیل
- کلونجی پین بام
- سفوف ظہیر
- اکسیر معدہ
- سفوف اپسرا
- سفوف دمہ
- کلونجی شوگر پاوڈر
- کلونجی چیون پراش
- اکسیر جگر
- معجون کلونجی
- کلونجی شیمپو پاوڈر
- مرہم کافوری
- روغن گیسو دراز

حسن بے مثال کی شان

جو دیکھے یہی کہے، بہت حسین لگتی ہے۔

MFG. MOHAMMEDIA PRODUCTS
Karim Nagar, (A.P.)

MRKT. BY S.J. AGENCIES
Opp : Rama Krishna Theatre, J.N.Road, Abids.
Ph : 66621834, 9346669505, 9346209091

ہمارے پراڈکٹس تمام میڈیکل ہال' دواساز اور جنرل اسٹورس پر دستیاب ھے

اس شمارے میں

اداریہ

	بیگ احساس	6

گوشۂ راج بہادر گوڑ

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ	اودھیش رانی گوڑ	8
ڈاکٹر راج بہادر گوڑ..... جہد کار و زبان و ادب کا خدمت گار	وہاب عندلیب	15
ڈاکٹر راج بہادر..... غزل، روایت اور فن	حبیب نثار	18
انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی صد سالہ تقاریب	محبوب خاں اصغر	21

خودنوشت

ڈگر سے ہٹ کر قصہ پارینہ	سعیدہ بانو احمد	28

آپ بیتی

یادیں	راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر / اشرف رفیع	34

افسانے

زرگزیدہ	یٰسین احمد	40
وطن واپسی	اسلم جمشید پوری	45

شاعری

راشد انور راشد، نبیل احمد نبیل، علیم صبا نویدی، خالد اقبال یاسر، سلیم انصاری	محمد علی منظر، سالم سلیم، قرۃ العین فاطمہ، عالیہ مرزا، مسعود جعفری، ناصر شاہی برہانپوری	52

مضامین

کارواں گزر گیا غبار دیکھتے رہے	صابر علی سیوانی	62
جدید غزل کی تخلیقیت	اویس احمد بٹ	66

مطالعہ

'غالب: ایک باز دید' پر ایک نظر	ندیم احمد انصاری	74

اداریہ

خمیازہ.......!

2019ء میں انتخابات ہونا طے ہے۔اس سے قبل بھی ہو سکتے ہیں۔ بی جے پی اور دوسری پارٹیوں نے تیاری کا آغاز کر دیا ہے۔ بی جے پی نے میڈیا پر پہلے ہی قبضہ کر رکھا ہے۔ راہل گاندھی نے پارلیمنٹ میں جو تقریر کی تھی اور اس کے بعد ڈرامائی انداز میں وزیرآعظم کے گلے لگے تھے اس کے کافی چرچے رہے۔لیکن وزیرآعظم نے ان سوالات کا کوئی جواب نہیں دیا انھوں نے بھی ہاتھوں کی مضحکہ خیز حرکتوں اور چہرے پر تمسخرانہ تاثرات کے ساتھ کم ڈراما بازی نہیں کی۔ پارلیمنٹ کا وقار متاثر ہوا۔ فی الحال بی جے پی اپنے حربوں میں کامیاب ہے۔آسام میں این آر سی کا شوشہ چھوڑ کر پورے ملک کو تشویش میں مبتلا کر دیا۔آسام میں بنگلہ دیشی پناہ گزینوں کا مسئلہ نیا نہیں ہے منموہن سنگھ نے راجیو گاندھی کے دور میں سپریم کورٹ کی نگرانی میں رہنمایانہ اصول بنائے تھے جس کا مقصد معاملے کو حل کرنا تھا۔ بی جے پی نے انتخابات سے قبل NRC کا عمل پورا کیا اور 40 لاکھ افراد کے نام خارج کر دیئے گئے۔ بی جے پی کہتی ہے کہ سپریم کورٹ کے احکام پر ہی این سی آر 1951ء کی تجدید کی گئی۔ آج بی جے پی اقتدار پر محض کانگریس کی غلطیوں کی وجہ سے فائز ہے۔ کانگریس نے اندرا گاندھی کے دور میں کئی ایسی فاش غلطیاں کیں جس کا خمیازہ آج ملک کی سیکولر عوام کو بھگتنا پڑ رہا ہے۔ایمرجنسی کے نفاذ نے اپوزیشن جماعتوں کو یکجا ہونے کا موقع دیا۔ جئے پرکاش نرائن ابھر کر آئے لیکن ان کی تحریک کو مرار جی دیسائی اور ان کے ساتھیوں نے مسخ کر دیا۔ کانگریس کے تمام سینئر رہنماؤں کو الگ کر کے اپنے نام پر پارٹی قایم کرنا۔ مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش بنانے میں مدد کرنا۔ مشرقی پاکستان کے پاکستان سے الگ ہونے کے بعد برصغیر میں دہشت گردی کا آغاز ہوا۔ پاکستان یہ زخم بھول نہ سکا۔ خالصتان کی تحریک کو کچلنا اور ایک سکھ کے ہاتھوں جان دینا۔ پھر سکھوں کے خلاف بھیانک فسادات! اندرا گاندھی کے بعد راجیو گاندھی

جیسے ناتجربے کار نوجوان کو قیادت سونپنا۔ کانگریس کی فاش غلطیاں ہیں۔ شاہ بانو کیس کا ردّعمل اب طلاق ثلاثہ کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔ راجیو گاندھی نے بابری مسجد کا تالا کھول کر بی جے پی کے لیے راہیں ہموار کیں۔ رتھ یاترا جس کا اختتام بابری مسجد کے انہدام کی صورت میں آیا۔ تمام ملک فسادات کی آگ میں جلنے لگا۔ ممبئی میں بھیانک فسادات ہوئے۔ جوداؤد ابراہیم کے بم دھماکوں کے بعد رُکے۔ لیکن مسلمانوں پر دہشت گردی کی مہر لگادی گئی۔ مودی نے گودھرا ٹرین کے حادثے کے جواب میں گجرات میں نسل کشی کا تجربہ کیا۔ اس کے بعد واجپائی، اڈوانی، مرلی منوہر جوشی وغیرہ مودی کے آگے پھیکے پڑ گئے۔ اور آج ملک ہندوراشٹر کی سمت گامزن ہے۔ ہندوستان میں این آر سی سے بہت خطرہ ہے۔ اگر آسام میں بنگلہ دیشی گھس آئے ہیں تو یہ بنگلہ دیش کے قیام اور وہاں کے باشندوں سے ہم دردی کا نتیجہ ہے۔ این آر سی سے آسام کی بیشتر تنظیمیں خوش ہیں۔ ایک ایسا سلسلہ چل پڑے گا جسے روکنا ممکن نہ ہوگا۔

ممبئی میں شیوسینا تامل باشندوں کے خلاف وجود میں آئی۔ اُتر پردیش میں بہاریوں کو برداشت نہیں کیا جاتا۔ دو تیلگو بولنے والے ریاستوں کے عوام ایک ساتھ نہیں رہ سکے۔ اب کاسموپولیٹن شہروں کا تصور ہی ختم ہوکر رہ جائے گا اور بہت ممکن ہے بی جے پی اسے ہندو مسلم رنگ دینا شروع کردے۔ بی جے پی اس طرح ممتا بنرجی پر بھی دباؤ بنائے ہوئے ہے۔ وہ اسی کی انتخابی ایجنڈہ بنائے گی۔ اپوزیشن کے متحد ہونے کے آثار بہت کم ہیں جس کا اندازہ راجیہ سبھا کے نائب صدرنشین کے الیکشن کے نتائج سے ہوگیا۔ اس معاملے میں بھی بی جے پی نے بہتر حکمت عملی سے کام لیا۔ کانگریس نے زیادہ سنجیدگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ این ڈی اے نے جے ڈی یو رکن پارلیمنٹ ہری ونش کو آگے بڑھایا کانگریس کی طرف سے ہری پرساد امیدوار تھے۔ این ڈی اے امیدوار کو بیجو جنتا دل، انا ڈی ایم کے اور، ٹی آر ایس کی تائید حاصل ہوئی۔ ٹی ڈی پی، وائی ایس آر کانگریس اور عام آدمی پارٹی کے ارکان اسمبلی ووٹ دینے کے دوران غیر حاضر رہے۔ کانگریس چاہتی تو عآپ سے ہاتھ ملا سکتی تھی۔ لیکن ایسا نہیں ہوا۔ ان انتخابات سے صاف ظاہر ہے کہ علاقائی پارٹیاں کانگریس سے بدظن ہیں اور اس سے ہاتھ ملانا نہیں چاہتی۔ تو کیا کانگریس کا دور ختم ہوگیا؟ سیکولر قوتیں کیسے یکجا ہوں گی؟ یہ ایک سوال ہے جس پر ملک کی قسمت کا دارومدار ہے۔

جناب چندر شیکھر راؤ یوم آزادی تقاریب قلعہ گولکنڈہ میں منائیں گے۔ چیف منسٹر بننے کے بعد انھوں نے ایک نئی اور صحت مند روایت قایم کی ہے۔ تمام قارئین کی خدمت میں ادارہ یوم آزادی کی مبارک باد پیش کرتا ہے۔

بیگ احساس

اودھیش رانی گوڑ

مضمون

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ

حیدرآباد وہ شہر ہے جہاں بہت سے لوگ ایسے پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اس شہر میں اپنا نام ہمیشہ کے لیے چھوڑا ہے۔ کمیونسٹ پارٹی کے دو اہم رہنما مخدوم محی الدین اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ ایسی جوڑی تھی جو حیدرآبادیوں کے دلوں میں بس گئی تھی۔ مخدوم محی الدین راج بہادر گوڑ سے دس برس بڑے تھے مگر دوستی ایسی تھی جیسے دونوں ہم عمر ہوں۔ 2008ء میں مخدوم محی الدین کی صد سالہ صدی سارے ہندوستان میں منائی گئی، اب راج بہادر گوڑ کی باری آئی ہے۔

قدیم شہر کے قدیم محلے گولی پورہ میں رائے ہری پرشاد سہ رشتے دار عرب مسلم جنگ کے پوتے کا جنم 21 جولائی 1918ء کو ہوا، یہ پہلے پوتے تھے۔

راج بہادر گوڑ کی ماں ضلع اعظم گڑھ کی تھیں، امراوتی نام تھا، ہری پرشاد کے بڑے لڑکے رائے محبوب کی بیوی تھیں۔

کائستھ گھرانوں میں روایت تھی کہ بارہ کائستھوں میں بھائی یعنی سکسینہ گوڑ، ماتھر، سری واستو، اشٹھانہ، وششٹ، بھٹناگر، بھردواج اور دوسرے جواب کم یاب ہیں جو اپنے آپ کو چتر گپت کی اولاد مانتے ہیں، آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے تھے۔ گوڑ خاندان گوڑ سے ہی اور سری واستو، سری واستو سے شادی کرتے۔ شادی کے رشتے شمالی ہند کے خاندانوں سے کیے جاتے تو یہ ہوتا کہ لڑکی اگر ایک بار سسرال آئی تو پھر وہ شاید کبھی میکہ نہیں دیکھتی کیوں کہ آمد و رفت بہت ہی مشکل تھی۔ امراوتی جو گوڑ کائستھ تھیں اس لیے ان کو محبوب رائے سے بیاہ کرا لایا گیا۔ راج بہادر گوڑ بتاتے ہیں کہ ان کی بڑی بہن تھیں اور ایک چھوٹا بھائی، بڑی بہن کا انتقال کب ہوا؟ انہیں یاد نہیں مگر ماں اور چھوٹے بھائی کی موت یاد تھی، حالانکہ یہ صرف تین برس کے تھے۔ والدہ نے اپنے دیور محبوب نارائن کو اپنے بیٹے کو سونپا جو 16 برس کے تھے اور وعدہ لیا کہ اس کی دیکھ بھال وہ کریں گے۔ ان کی والدہ کے انتقال کے بعد گھر میں ایک بال ودھوا پھوپی تھیں۔ دادا، باپ اور ایک چچا جن کے چار بچے تھے۔ سب سے چھوٹے بیٹے رائے بالا پرشاد گوڑ تھے جو سکریٹریٹ میں ملازم تھے، مزاحیہ پروگراموں سے جانکاری رکھنے والے، ان سے واقف ہیں، بزلہ سنجی سے خوب واقف تھے، ہر وقت ہنسنا ہنسانا ان کا مشغلہ تھا۔

صنف نازک کے نرم و نازک ہاتھوں کے لمس سے راج بہادر گوڑ محروم کر دیے گئے، چچا نے حسب وعدہ بھتیجے کی دیکھ بھال کی۔ محبوب رائے صاحب نے گھر چھوڑا اور سکسینہ خاندان میں شادی کر لی۔ دادا ناراض ہو گئے تھے مگر پوتے پر نظر عنایت رہی۔ راج بہادر گوڑ بتاتے تھے کہ کس طرح اپنے دادا کو ستایا کرتے تھے، خاص طور پر گاندھی جی کے عقائد کی تائید کر کے ... ان ہی دنوں گاندھی جی حیدرآباد آئے تھے۔ مال والا پیالیس میں ٹھہرے تھے اور ویدک دھرم پرکاش کار مراٹھی میڈیم کے قدیم مدرسے میں تقریر بھی کی تھی۔

ان کے چچا نے ان کی اچھی تعلیم کے لیے ایک ہاسٹل حیدر گوڑہ میں کھولا جس میں بہت سے کائستھ اور مسلم بچے رہتے تھے مگر ان کے انٹر میں آنے تک یہ ہاسٹل مالی مشکلات کا شکار ہو گیا اور پھر گولی پورہ واپس آ گئے۔ یہاں آنے کے بعد چچا نے ان کو ترقی پسند نظریات کی طرف راغب کر دیا۔ مخدوم محی الدین جو سٹی کالج کی ملازمت سے مستعفی ہو کر کمیونسٹ نظریات کو اجاگر کر رہے تھے اور محبوب نارائن سے ان کی اچھی دوستی تھی۔ ڈسمبر 1925ء کو کمیونسٹ پارٹی آف انڈیا تشکیل پائی لیکن ریاست حیدرآباد کے نوجوان اس

کے رکن نہیں بن سکے، ایک تنظیم کامریڈ اسوسی ایشن کے نام سے چلائی گئی۔ اس کی ابتدائی مجلس عاملہ کے اراکین تھے، کامریڈ ابراہیم (کامریڈ مظہر مہدی کے والد) کامریڈ قطب عالم (قطب عالم صاحب انجینئر تھے، چار برس قبل ملاقات ہوئی تھی) ان کے لڑکے بھی چیف انجینئر کے عہدے سے ریٹائر ہوئے، امید کہ قطب عالم صاحب بقید حیات ہوں گے) کامریڈ اونکار پرشاد، کامریڈ مانک لال گپتا، کامریڈ عالم خوندمیری، کامریڈ جواد رضوی شامل تھے اور راج بہادر گوڑ ہ کنوینر تھے۔ عجیب سی بات تو یہ تھی کہ اس زمانے کے مشہور صحافی قاضی عبدالغفار صاحب اور راج بہادر گوڑ نے ایک دوسرے سے کوئی ملاقات نہیں کی تھی، حالانکہ پیام میں ان کا مضمون چھپا پا تھا۔ جب طب کی تعلیم میں داخلہ لیا تو اس زمانے میں اچھے طالب علم کو وظیفہ ملتا تھا جو دس روپے اور پندرہ روپے ہوا کرتا تھا۔ پندرہ روپے اول آنے پر اور دس روپے دوم آنے پر اس کے علاوہ ان کی فیس بھی معاف ہوتی تھی۔

مدرسے میں سب سے زیادہ عزیز استاد جائسی تھے جو اردو کی طرف ان کی دلچسپی بڑھاتے تھے۔ میڈیسن کے ززانے میں وہاں کے میگزین ایڈیٹر بھی بنے اور اسی میں ڈاکٹروں کے مسائل پر اداریہ لکھا جس کے نتیجے میں میڈیسن کے استاد نے ان کو فیل کر دیا لیکن دوسرے استاد نے پرنسپل سے گزارش کر کے دوبارہ امتحان لیا اور وہ واپس جماعت میں آگئے۔ میرے خیال مس ے ایک حادثہ ان کی زندگی کی دھارا بدلنے میں اہم تھا۔ انہوں نے طے کر لیا تھا کہ وہ صرف لوگوں کے مسائل پر دھیان دیں گے چنانچہ چوتھے سال ہی میں انہوں نے میڈیسن چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا اور کمیونسٹ پارٹی میں شامل ہونے کا بھی۔ اس وقت انہوں نے اپنے چچا کو خط لکھا کہ ''مجھے کارل ماکس کی آواز سنائی دے رہی ہے اور میں اس کا حامی ہوں۔'' سنا ہے کہ چچا بہت ناراض ہوئے اور ان کو مارا بھی مگر والد محبوب رائے ممبئی گئے اور پی سی جوشی (کمیونسٹ پارٹی کے پہلے جنرل سکریٹری) سے ملاقات کی اور صورت حال کو سمجھایا۔ کامریڈ جوشی نے ایک خط راج بہادر گوڑ کو لکھا جس میں ان کی تعلیم پر زور دیا اور کہا کہ وہ اپنی تعلیم مکمل کر لیں اور اس کو پارٹی کا حکم سمجھ کر انہوں نے میڈیسن کی تعلیم مکمل کی۔ 1942ء میں امتحان ہال سے نکل کر سیدھے گھانس منڈی سکندرآباد پہنچے پھر گھر والوں کو معلوم ہو گیا کہ وہ اب ہم سے دور ہی ہو گئے ہیں۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی شادی ہو گئی تھی ۔ بیوی سنجیو گپتا بہت بڑے خاندان سے تھیں، مشتر کہ خاندان میں چالیس بھائی اور وہ ایک ہی لڑکی تھیں اور اسی خاندان میں ہندی کے مشہور مزاحیہ شاعر بے ڈھب بنارسی بھی تھے جنہوں نے غالب کے دیوان کو پہلی بار ہندی رسم الخط میں منتقل کیا تھا۔ گھانس منڈی میں رہتے ہوئے راج بہادر گوڑ نے اپنی بیوی کو ساتھ رکھنے کا ارادہ کیا جس کے لیے گھر والے تیار نہیں تھے...

مگر وہ اپنی بیوی کو بھی ساتھ لے کر گئے... وہیں ان کا پہلا بیٹا تیج بہادر پیدا ہوا جو آٹھ برس کی عمر میں دنیا سے رخصت ہو گیا۔ راج بہادر کے لیے یہ بڑا صدمہ تھا مگر پارٹی کا سہارا ایسا تھا کہ وہ اس غم کو بھی کچھ عرصے بعد بھول گئے۔ اس کے بعد ان کے چچا بھی آبکاری ملازمت کے تحت اضلاع چلے گئے 1942ء سے 1948ء تک چچا اوران کے خاندان سے کوئی واسطہ نہ رہا نہ ہی خط و کتابت قائم رہی۔ 1947ء کے بعد کمیونسٹ پارٹی پر امتناع عائد ہو گیا اور سب ہی قائدین روپوش ہو گئے پھر ایک دن اچانک ایک افواہ اڑی کہ پابندی اٹھا لی گئی ہے اور ایک سیاسی جماعت سے معاہدہ بھی ہوا ہے۔ اس افواہ کی تردید کے لیے ایک جلسہ حشمت گنج میں بلایا گیا، جسے راج بہادر گوڑ مخاطب کرنے والے تھے۔ حشمت گنج میں بیشتر گجراتی گھر تھے جہاں جلسے کا اہتمام ہوا تھا۔ وہاں پر ایک گجراتی کامریڈ یشودا بین کے ہاں ایک پٹرومکس کو میز پر کھا گیا تھا اور جب تقریر شروع ہوئی تو پولیس آگئی اور اس نے اپنا گھیرا تنگ کرنا شروع کر دیا۔ اس عرصے میں پٹرومکس کی بتی دھیمی کر دی گئی

اور کسی راستے سے راج بہادر گوڑ فرار ہوگئے۔ پولیس کو پتا نہ چلا، وہ سائیکل پر عیسیٰ میاں بازار کے راستے اپو گوڑہ کے دلم میں پہنچ گئے۔ پولیس ڈھونڈتی رہ گئی لیکن اس کے چھ ماہ بعد گرفتار ہوگئے اور چنچل گوڑہ جیل میں رکھے گئے۔ یہاں ایل مہندرا جو بنگال میں شانتی نکیتن کے طالب علم رہ چکے تھے اور آسنسول میں کمیونسٹ پارٹی سے وابستہ تھے نے ایک منصوبہ بنایا کہ کس طرح ان لوگوں کو جیل سے بھگایا جائے۔اس سے پہلے بھی کامریڈ مہندرا کچھ کامریڈس کو عدالت سے بھگانے میں کامیاب ہو چکے تھے۔انہوں نے جیل میں دو قیدیوں یعنی راج بہادر گوڑ اور جواد رضوی کو دانت کے درد کی شکایت کرنے کو کہا اور جب یہ دونوں عثمانیہ دواخانہ پہنچے تو وہاں کچھ ڈاکٹر تیار تھے، ان کو ڈینٹل سرجن کے پاس لے گئے اور ڈینٹل سرجن آر ایم ایو کے بلانے پر کیبن چھوڑ کر باہر گئے۔ یہ دونوں حضرات دوسرے دروازے سے بیگم بازار کی کولسہ واڑی سے نکل کر اعتبار چوک تک پہنچ گئے۔ جب ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تو پتا چلا کہ کیبن میں کوئی بھی نہیں ہے۔ پولیس نے گاڑیوں کی زبردست تلاشی لی مگر یہ دونوں اپنے پیروں پر چلتے ہوئے پولیس کی نظر سے بچ گئے،اس فراری کو ہمیشہ یاد رکھا گیا جب نکسلائٹ لیڈر پولیس عہدہ داروں کو گولی کا نشانہ بنا کر فرار ہوئے تھے۔اس وقت اخبارات نے امن اور شانتی سے فرار ہونے والے راج بہادر گوڑ کا تذکرہ کیا تھا۔

جب روپوشی کا زمانہ تھا تو ہمارے پڑوسی بھی بہت مدد کرتے تھے، پولیس کی چوکسی کو منٹوں میں ختم کر دیتے تھے۔ایسے بتاتے تھے اگر کمیونسٹ یہاں آئیں تو فوراً اطلاع کریں گے۔ یہاں ایک بات اہم یہ ہے کہ نظام کی پولیس کی کارکردگی بہت اچھی تھی، چوراچکوں سے بچاؤ کے لیے ہر گلی کے نکڑ پر ایک موچی بیٹھا ہوتا تھا جو پولیس کا مخبر ہوا کرتا تھا۔مگر یہی موچی ان کمیونسٹوں کو پولیس کے آنے کی بھی خبر دیتا تھا۔1948ء سے 1951ء کا دوران سارے کمیونسٹوں کے لیے بہت ہی آزمائشی دور تھا، رضا کار بھی عوام کو لوٹنے لگے تھے۔ میں یہ بتا دوں کہ یہ رضا کار صرف مسلم ہی نہیں تھے بلکہ اعلیٰ ذات کے ہندو بھی تھے۔

کمیونسٹ ابھی یہ طے نہیں کر پائے تھے کہ حکومت ہند کا ساتھ دیں یا ہتھیار بند لڑائی کو جاری رکھ کر انقلاب لائیں۔اس کے لیے مشورہ لینے چار کمیونسٹ لیڈروں کا جتھا اسٹالین سے ملنے گیا مگر اسٹالین نے دو تین سوالات میں ہی ان کو قائل کر دیا کہ ہتھیار بند تحریک چھوڑ کر انتخابات میں حصہ لے کر حکومت ہند کا ساتھ دیں تاکہ سوشلزم کو مضبوطی ملے کیوں کہ بات بہت معقول تھی، اس لیے مان لی گئی اور کمیونسٹوں نے طے کیا کہ اس پر عمل کیا جائے گا۔اسی بیچ حیدرآباد انڈین یونین میں شامل کر لیا گیا اور ملٹری پولیس نے چن چن کر کمیونسٹوں کو گرفتار کیا اور حیدرآباد پولیس نے چن چن کر گولی ماری۔ کامریڈ یاد گیر جن کا مشہور نغمہ تھا اے بنڈی لہ واستوا، گوڑ کا نظام سرکا روڈا اور کامریڈ رنگا چاری جو پینٹر اور آرٹسٹ تھے جیل ہی میں گولی ماردی گئی۔ایسے دہشت زدہ ماحول میں راج گیر کی پہاڑیوں میں چھپے دو کامریڈ باہر آئے، ایک راج بہادر گوڑ اور دوسرے ریڈی تھے۔ پولیس نے راج بہادر گوڑ کو زندہ پکڑ لیا مگر ریڈی انکاونٹر میں مارے گئے۔

پولیس کے پاس گوڑ کی کوئی تصویر نہیں تھی اس لیے شناخت مشکل تھی۔ پولیس کسٹوڈی میں دو بجے رات کو جس شخص کو بلایا گیا اور اس کو قیدی کا نام اور بیان بتایا تو فوراً سمجھ گئے کہ اگر شناخت کرتا ہوں تو یہ بھی انکاونٹر ہوگا۔اس نے نیند کا بہانہ بنایا اور کہا کہ صبح دیکھیں گے، شاید کوئی پاگل ہے اور اس کے بعد موٹر موٹر سائیکل سے حیدرآباد آئے اور گولی گوڑہ کے ایک خانگی پریس میں ورقیہ چھپوائے جس پر صرف یہ لکھا تھا کہ راج بہادر گوڑ گرفتار ہوگئے اور یہی بات انگریزی میں تھی اس کے بعد وہ ورقیہ شہر کی سڑکوں پر پھیل گئے۔اب سنیے وہ مکالمہ کیا تھا:

پولیس مین: آپ راج بہادر گوڑ ہیں؟

راج بہادر گوڑ: جی اسی نام سے پکارا جاتا ہوں۔

پولیس مین: آپ ڈاکٹر ہیں؟

راج بہادر گوڑ: آپ کو کیا تکلیف ہے؟

پولیس مین: آپ کے والد کا نام محبوب رائے ہے؟

راج بہادر گوڑ: بہت چھوٹا تھا جب ماں مرگئیں میں نے ٹھیک سے پوچھا نہیں۔

یہاں پولیس والے کو شک آیا کہ موت کے دہانے پر کھڑا شخص اطمینان سے مذاق کر رہا ہے، اس لیے اس نے شناخت کروانے کا فیصلہ کیا جو راج بہادر گوڑ کے لیے زندگی بچانے کا بہانہ بنا۔ ایک ورقیہ لے کر سردار سنگھ جو خفیہ پولیس میں تھے ہمارے گھر آئے۔ صبح کے پانچ بجے تھے محبوب نارائن کے چائے پینے کا وقت، انہوں نے پورے خلوص سے سردار سنگھ کو چائے پیش کی تو انہوں نے ورقیہ سامنے رکھا۔ ان کے چہرے پر اداسی چھا گئی، گھر میں اطلاع کیسے کریں؟ کیوں کہ سردار سنگھ کو شک تھا کہ وہ مار دیے گئے ہیں...

گھر میں چولہا بجھا دیا گیا، کسی کو کھانے کا ہوش بھی نہیں تھا، سہمے ہوئے تھے... یہ خیال تھا، اب خبر پہنچی کہ اب پہنچی...

اب راج بہادر گوڑ کے ساتھ کیا ہوا، یہ سنیے، انہیں مارنے کا سوال اس لیے نہیں تھا کہ ملٹری پولیس پکڑی تھی۔ وہ قیدیوں سے سچ اگلوانے کے لیے انہیں زندہ پکڑنا ضروری سمجھتی تھی۔ انہیں ورنگل جیل بھیجا گیا، بریانی کھلائی گئی اور پانی سے دور رکھا یعنی پینے کو ایک گھونٹ بھی نہیں ملا۔ پھر ایک مہینے بعد مشیرآباد جیل میں لایا گیا ہے۔ یہیں پر کامریڈ جیوتی باسو کمیونسٹ قیدیوں سے ملنے آئے تھے اور انتخابات میں حصہ لینے کی تجویز کو قبول کرنے کا اعلان بھی کیا۔

ان کے جیلر بڑے دلچسپ آدمی تھے، ہر پندرہ منٹ بعد اس بات کا اعلان کرتے کہ وہ جواہر لال نہرو کے بھی جیلر رہ چکے ہیں۔ اس پر راج بہادر گوڑ کہا کرتے تھے: تم نے میری سونے کی گھڑی اور بٹن لے لیا جبکہ یہ میرے چچا کا تحفہ تھا... مگر جواہر لال کے پاس تو بہت کچھ ہوگا کبھی اس کے بارے میں بھی بتاؤ... جیلر صاحب مسکرا کر چپ ہو جاتے، یہ مکالمہ اکثر اس وقت عام تھا جب اہل خاندان ملنے کے لیے جاتے تھے۔

1952ء میں پہلے انتخابات ہوئے اور خوب ہوئے، کمیونسٹ پارٹی نے پی ڈی ایف کے ٹکٹ پر انتخابات لڑے تھے، جئے سوریا، سروجنی دیوی کے بھائی جو ڈاکٹر تھے اور پہلے ہومیوپیتھی کے ڈاکٹر مشہور تھے۔ اسمبلی کے انتخابات مخدوم صاحب ایک حلقے سے جیتے اور دوسرے سے ہار گئے تھے۔ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ راجیہ سبھا کے رکن منتخب ہوئے مگر جیل ہونے کی وجہ سے سشن میں شرکت نہیں کر سکتے تھے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن کو جب بتایا کہ ان پر قتل اور چوری کے الزامات ہیں اور قید میں ہیں، مقدمات کے فیصلوں تک رہائی ممکن نہیں تب رادھا کرشنن کہا تھا: ہر پاپ کرنے والے کا ایک مستقبل ہوتا ہے اور نیک آدمی کا بھی ایک ماضی ہوتا ہے۔ جب تک وہ راجیہ سبھا میں نہیں آئیں گے، سشن شروع نہیں ہوگا۔ ان کو اپنے آبائی مقام گولی پورہ سے بہت پیار تھا۔ وہ جیل سے رہائی کے فوری بعد گولی پورہ ہی آئے تھے پھر جب ان کے کولہے کا آپریشن ہوا تو

بعد میں ڈاکٹر نے پوچھا: آپ کا گھر کہاں ہے؟ تو انہوں نے فوراً کہا گولی پورہ حالانکہ وہ پچھلے پچاس برس سے باغ لنگم پلی میں رہتے تھے۔

روپوشی کے دوران مرد اور عورت ایک جگہ رہتے تھے، آگ اور پیڑوں کا ساتھ تھا۔ پارٹی کے رہنماؤں نے اس بات کو محسوس کیا اور کسی غیر اخلاقی حرکت کو روکنے کے لیے عورتوں کی مرضی جان کر ان کے ساتھ شادی کرنے کی تجویز رکھی اور کئی لوگوں نے شادیاں کیں۔ براج رانی نے راج بہادر گوڑ کو چنا اور شادی ڈیکلیر ہوگئی۔ برج رانی کو 3 اپریل 1952ء ایک لڑکی ہوئی جو تمارا کہلاتی ہے۔

اس نے بھی ماسکو سے میڈیسن میں ڈگری لی اور آئی ڈی پی ایل میں کام کیا۔

1953ء میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ، نواب میر احمد علی خان اور حبیب الرحمٰن صاحب نے اپنے دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ اردو کے تحفظ کے لیے اردو ٹرسٹ بنایا۔ ان لوگوں نے سڑک پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کم از کم ایک روپیہ کا چندہ مانگا، اسی فنڈ کو بڑھاتے رہے۔ حبیب الرحمٰن صاحب نے تو اپنی ساری جائیداد اردو کے لیے وقف کر دی۔ راج بہادر گوڑ بحیثیت کمیونسٹ ہونے کے اپنے نظریات کے تحت پیسہ جمع کرنے کے قائل نہیں تھے۔ اس لیے کوئی جائیداد وغیرہ تو نہ دے سکے مگر جب چھٹے پے کمیشن نے پارلیمنٹ کے ممبروں کو کچھ بقایاجات دیے تو انہوں نے وہ ساری رقم اردو تعلیمی ٹرسٹ کو دیدی۔

لوگ شاید سمجھتے ہوں گے کہ وہ اردو کے ہی حامی تھے مگر وہ ہر کسی کا مادری زبان پر اس کا اپنا حق ہوتا ہے کہ قائل تھے۔ تلگو میڈیم اسکول بھی کھولنے کے لیے کوشش کرتے رہے ہیں۔ ان ہی دنوں کی بات ہے جب وہ روپوش تھے تو لنگوٹ میں بھاگ کھلنا کیا ہوتا ہے؟ معلوم ہوا۔ ہوا یوں کہ مخدوم محی الدین صاحب کو بریانی کھانے کا من ہوا، راج بہادر گوڑ صاحب پکوان میں ماہر تھے مگر چاول اور گوشت کہاں سے لاتے۔ راشن کا زمانہ تھا، باسمتی، خواب میں بھی نہیں دکھائی دیتے۔ کسی طرح سے کچھ مصالحے اور موٹا چاول تو مل گیا، گوشت کا سوال تھا۔ بکرے کا گوشت زیادہ قیمت کا تھا مگر بیف سستا تھا۔ تو بیف کی بریانی بنائی گئی سوال تھا میٹھے کا تو چاول میں شکر اور تھوڑی سا گھی ڈال کر پکا لیا، چرونجی مل گئی کیوں کہ اس زمانے میں بہت آسانی سے یہ مل جاتی تھی۔ مخدوم محی الدین بیف نہیں کھاتے تھے، یہ بات ان کو بہت بعد میں پتا چلی۔ کافی ناراض ہوئے لیکن راج بہادر گوڑ کے پکوان کی تعریف بھی کی۔

سردار ولبھ بھائی پٹیل کے زمانے میں کمیونسٹوں پر بہت ہی ظلم ہوا تھا اور روپوش کامریڈس کے کھانے پینے کے لالے پڑ گئے تھے۔ اس زمانے میں کامریڈ امولک رام کی بہنیں اس طرح کا کھانا جو دس پندرہ دن تک بھی چل سکے بنا کر بھیجا کرتی تھیں تا کہ ان لوگوں کو بھوک سے نڈھال نہ ہونا پڑے۔

راج بہادر گوڑ بہت ہی مضبوط کردار کے حامل تھے، گھر میں کئی بہنیں اور بھائی تھے جو عمر میں ان سے کافی چھوٹے تھے۔ اس کے باوجود جس شہر میں جاتے دو چار بہنوں کا اضافہ کر لیتے۔ منظور الامین کی بیوی رفیعہ منظور الامین ان میں سے ایک تھیں جو ہر سال راکھی بھیجتی تھیں۔ وہ کینسر کی مریضہ تھیں اور انہوں نے ایک دن بہت خوبصورت راکھی بھیجی، گوڑ صاحب نے اسے فریم کروالیا کیوں کہ وہ ان کی جانب سے آخری راکھی تھی۔

راج بہادر گوڑ کو جھوٹ بولنا بالکل نہیں آتا تھا، مذاق میں بھی جھوٹ نہیں بولتے تھے۔ مرضی کے خلاف کوئی بات اکثریت کو پسند ہو تو خاموش ہو جایا کرتے۔ شراب نوشی کائستھوں میں ایک عبادت سمجھی جاتی ہے مگر چچا نہیں پیتے تھے، اس لیے وہ کبھی بھی شراب پی کر ان کے سامنے نہیں جاتے تھے۔ مخدوم محی الدین کے انتقال کے بعد بہت سے ساتھیوں نے سگریٹ چھوڑ دیا اور راج بہادر گوڑ نے بھی چھوڑ دیا مگر اس سے پہلے وہ ہمیشہ اس بات کا خاص خیال رکھتے تھے کہ وہ چچا کے سامنے سگریٹ نہ پئیں۔ حالانکہ چچا اس بات سے واقف تھے، جیل میں ہر ماہ چار مینار سگریٹ کے دو ڈبے روانہ کرتے تھے۔

انہوں نے ایک اسمبلی اور ایک پارلیمنٹ کا الیکشن لڑا جس میں ہارے، یہ ہار ان کی نہیں بلکہ ان کے نظریہ حیات کو دھکا تھا۔

اب ان کا وقت کمیونسٹ پارٹی اور اردو کی بقا رہا، انہوں نے ترقی پسند مصنفین کا احیا اور اردو جس کا کوئی صوبہ نہیں اس لیے حیدرآباد میں ایک شاخ قائم ہوئی۔ جناب راشد آذر اس کے

سکریٹری بنائے گئے، اردو ہال میں باضابطہ اس کے اجلاس ہوتے، وقت کی پابندی سب سے بڑی شرط تھی۔

دہلی سے کمیونسٹ پارٹی کا اردو ترجمان کمیونسٹ جائزہ نکالا جس میں شمیم فیضی معاون تھے۔ ان کی تین اردو کتابیں جو مختلف موضوعات پر لکھی گئیں، مضامین پر مشتمل ہیں، ادبی مطالعہ، ادبی تناظر اور ادبی جائزے پھر ایک انگریزی مضامین کا مجموعہ Random Writing شائع ہوا۔

برج رانی اور سنجو گیتا یعنی پہلی اور دوسری بیوی ایک ہی گھر میں رہتے تھے، تمارا اور کلرا دونوں لڑکیاں جو برج رانی کی بیٹیاں تھیں منجو گیتا بھی بے حد مانوس تھیں۔ پھر سنجو گیتا کا انتقال دل کی حرکت بند ہونے سے ہوگیا اور ادھر براج رانی کی بھی صحت ٹھیک نہیں رہتی تھی مگر راج بہادر گوڑ کی سرگرمیوں میں کوئی فرق نہیں آیا۔ وہ سارے گھر میں راجن کے نام سے جانے جاتے تھے، کوئی بھیا لگا لیتا کوئی چاچا... گھر آتے تو جیسے رونق آجاتی، سبھی بہن بھائی اس کوشش میں ہوتے کہ وہ ان سے زیادہ بات کریں۔

''چنبیلی کا منڈوہ'' سوریہ نگر میں تھا جو ان کا گھر تھا، اسی میں برج رانی نے بھی ساتھ چھوڑ دیا۔ یہ تنہائی واقعی ان کے لیے جان سوز تھی۔ ایک دن وہ گھر کے سامنے ہی ایک گڑھے میں گر پڑے، کولہے کی ہڈی ٹوٹی، یہی ان کی سرگرمیوں کو کم کرتی گئی۔ کچھ عرصہ بعد وہ حمام میں نل پر گر پڑے جس سے ان کی بائیں آنکھ پھوٹ گئی مگر انہوں نے اسے بہت ہی معمولی بات سمجھا اور ڈاکٹر کو بتایا کہ ان کی بائیں آنکھ اس لیے پھوٹی کہ وہ بائیں بازو کے آدمی ہیں۔ سروجنی دیوی کا ڈاکٹر اس گہرے مذاق کو سمجھ نہ سکا۔ ڈاکٹر رنگا ریڈی آئی اسپیشلسٹ کو پتا چلا تو انہوں نے کہا کہ میرے پاس آیئے، میں ٹھیک سے دیکھ لوں گا.. مگر راج بہادر نے کہا: اب تمہاری پرائیوٹ پریکٹس ہے، میں سرکاری دواخانے میں علاج کرتا ہوں۔ رنگا ریڈی نے کہا کہ اگر آپ نہیں آئیں گے تو میں خود آوں گا اور آپ کو لے جاؤں گا۔ گوڑ صاحب فوری ان کے پاس پہنچے، انہوں نے آنکھ ہی نکال دی اور کہا کہ اگر اور کچھ وقت گزرتا تو وہ زخم خطرناک ہوجاتا۔

اب مطالعہ ایک آنکھ سے جاری رہتا، وہ لکھتے بھی رہتے جس میں دوستوں اور بہنوں کے خطوط کے جواب ہوتے۔ کچھ لڑکیاں جو انہیں بابا کہتیں، اپنے ذاتی مسائل لکھتیں اور صلاح چاہتی تھیں۔ یادگیر سے ایک خاتون کی فرمائش کہ ان کے بھائی کی شادی پر تشریف لائیں اور بہت دن گزر گئے ہیں، اس لیے ٹیلی فون کی زحمت گوارا کریں۔

ارتضیٰ کریم صاحب کو فکر ہے کہ ان کی کتاب پر تبصرہ نہیں کیا ہے اور کیا ہے تو کہاں کیا ہے؟

علی احمد فاطمی صاحب کے بہترے خطوط فراق گورکھپوری کی صدی کے تعلق سے تھے۔

رحمت امروہی نے مجبوری بتائی کہ وہ مضمون نہیں چھاپ سکتے کیوں کہ وہ اردو کے گجرات کے شعرا اور ادیبوں پر ہی مضامین چھاپ رہے ہیں۔

خورشید صاحب حیدرآباد کی یاد کو کراچی سے تڑپ تڑپ کر دکھا رہے ہیں، وہ لکھتے ہیں کہ قمر رئیس صاحب اکثر حیدرآبادیوں کی اطلاع دیتے ہیں۔

شاہ جہاں پور کے صبا بلگرامی اپنے چچا جو یشودا ہاسپٹل میں ہیں، افسوس کرتے ہیں کہ بدرالحسن صاحب کی تیمارداری نہ کرسکے کیوں کہ وہ سرکاری ملازم ہیں۔

سلمیٰ شاہین کے بہت سے خطوط ہیں، کافی سرگرم خاتون ہوں گی، کبھی قمر رئیس صاحب کے لیے مجلّہ نکال رہی ہیں تو کبھی ساغر نظامی کے لیے کچھ نہ کچھ کررہی ہیں۔

قمر رئیس صاحب یوں تو دل کے مریض ہیں مگر لکھنو میں ہونے والی ترقی پسند مصنفین کی کانفرنس میں شریک ہونے کے لیے تیار

ہیں ۔ایک اور خط میں وہ جوش اور فراق گورکھپوری کی صد سالہ تقاریب میں مصروف ہیں۔

راج بہادر گوڑ فروغ اردو کے وائس چیرمین ہو گئے تھے تو قمر رئیس صاحب نے مشورے دیے تھے کہ ایسا گروپ بنائیں جو شاطر لوگوں کے خلاف کھڑا ہو سکے، مگر اس کے برخلاف گوڑ صاحب نے تمام ممبروں کو تنبیہ کی کہ اگر وہ کسی اور ادارے میں آئیں اور فروغ اردو میں شرکت کریں تو کرایہ پہلے والے ادارے سے لیں ۔کبھی خود انہوں نے بھی ہوائی جہاز کا کرایہ نہ لیا بلکہ فریڈم فائٹر کی حیثیت سے ٹرین میں مفت سفر کرتے تھے ۔اس طرح کئی لوگ ان سے ناراض بھی ہوئے مگر کچھ عرصہ بعد وہ اس سے مستعفی ہو گئے کیوں کہ حکومت بدل گئی تھی۔

ٹائمز آف انڈیا کے ایک ایڈیٹر صاحب کرشن چندر کی کتاب چھاپنا چاہتے ہیں اور اردو کی خدمت کے لیے تیار کھڑے ہیں صرف گوڑ صاحب کا اشارہ درکار ہے، ویسے وہ شگوفہ کے خریدار بن گئے تھے ۔خط سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی سفارش کے لیے کہا تھا اور جواب کا انتظار کر رہے تھے۔

ایک اور خاتون نے اپنی ساری پریشانیاں لکھ بھیجیں اور شاید وہ چاہتی تھیں کہ راج بہادر گوڑ ان کو فون کر کے ان کی پریشانیاں دور کر دیں۔تقرر کے لیے سفارشی خط لکھا مگر صدر جناب جعفر رضا سے یہ خوش نہیں ہیں، اس لیے مضبوط سفارش کے لیے لکھا۔یوسف ناظم صاحب کا خط خالص ادبی ہے، ساری ادبی کتابوں پر تبصرہ ہے، پرانی شراب اور پرانے چاول کا ذکر ہے۔

2010ء میں راج بہادر گوڑ کے ملازم نے جو ریڈ کراس سوسائٹی کی طرف سے ان کی دیکھ بھال کے لیے مامور تھے ۔ان پر جان لیوا حملہ کیا، اس وقت یہ طے پایا کہ گوڑ صاحب اپنے کسی عزیز کے ساتھ یا پھر کمیونسٹ پارٹی کے اولڈ ایج ہوم میں رہیں ۔اس اولڈ ایج ہوم میں ہنگل صاحب کے لیے بھی انتظام کیا گیا تھا مگر دوری دونوں کو برداشت نہیں تھی پھر وہاں تلگو بولنے والے تھے، اردو داں کم تھے ۔ جب میں نے کہا کہ میرے ساتھ رہیے تو سوچنے لگے کیوں کہ دوسرے بھائی بہن بھی امیدوار تھے ۔شاید میرے پارٹی سے وابستہ ہونے کا خیال ان کے دل میں تھا، میرے گھر چلے آئے ۔اردو ہال میں رحیم خان صاحب کے بھتیجے محبوب صاحب کی ڈیوٹی تھی، ہفتے میں دو بار کتابیں آتیں اور واپس بھی کر دی جاتی تھیں ۔ جب کوئی ملنے آتا تو پہلے خاموش رہتے جب وہ لوگ مجھ سے گپ لڑانے لگتے تو کہتے ''بلور بردھن پرساد، عابد حسین، عزیز پاشا سب تجھ سے بات کرتے ہیں، مجھ سے کوئی نہیں بولتا۔

سعید الرحمٰن (جگر) رکن الدین نے ان کے لیے محفل سجائی اور جگل بندی سے محظوظ ہوئے تو فرمائش کی ایک مشاعرہ بھی ہو، پھر ایک مشاعرہ بھی ہوا ۔ اس طرح کوشش رہی کہ ان کی سرگرمیوں کو کچھ جلا ملے۔

دسہرہ آیا، لوگ ملنے آئے مگر چہک چہک کے بولنا بولا راجن بالکل خاموش ٹکر ٹکر سب کو دیکھتا کبھی مسکراتا۔قمر جمالی صاحبہ آئیں تو پتا نہیں کیوں ان کی آنکھ بھر آئی ۔اس طرح دسہرہ بیت گیا، دوسرے دن سانس تیزی سے چلنے لگی ۔ اسپتال لے گئے ، ڈاکٹروں نے محنت تو کی مگر 7 اکتوبر 2012ء لکھا لائے تھے، سوا آٹھ بجے ڈاکٹر نے تمارا سے کہا Sorry۔۔اس طرح ہمارے خاندان کا سب سے چمکتا چراغ، ڈاکٹر، ادیب، سیاست داں اور ایک خوش مزاج انسان اپنی ایک آنکھ بھی بند کر گیا اور جو وصیت لکھی تھی، اس میں بینک میں اگر پیسہ ہو تو کمیونسٹ پارٹی کے حوالے کر دیا جائے اور جسم خاکی میڈیکل کالج کے ...اہل خاندان اور پارٹی اراکین نے اس وصیت کا احترام کیا۔

☆☆☆

وہاب عندلیب

مضمون

ڈاکٹر راج بہادر گوڑ..... جہد کار و زبان وادب کا خدمت گار

ڈاکٹر راج بہادر کا شمار دکن کی ان چند گنی چنی شخصیتوں میں ہوتا ہے جن کا نام ملک کے سیاسی، علمی وادبی حلقوں میں نہایت احترام سے لیا جاتا ہے۔ وہ ایک نامور ٹریڈ یونین رہنما، مدبر، عاشق اردو، مبصر، ناقد و دانشور کی حیثیت سے ریاستی و ملکی و بین قومی سطح پر اپنی شناخت رکھتے ہیں وہ مارکسزم کے امیر اور سماجی انصاف کے سرگرم وکیل تھے۔

ڈاکٹر گوڑ سے شخصی تعارف تو بعد میں ہوا۔ انٹرمیڈیٹ کے بعد جب داخلہ آرٹس کالج عثمانیہ یونیورسٹی میں ہوا تو یہاں بار بار مخدوم محی الدین کے ساتھ راج بہادر گوڑ کا نام بھی سماعتوں سے ٹکراتا رہا۔ انھیں دیکھنے اور ملنے کا اشتیاق شدت سے ابھرنے لگا۔ اسی اثنا میں گلبرگہ کے چند طلبہ نے گلبرگہ اسٹوڈنٹ یونین کا ٹیج کے نام سے ایک اقامت خانہ، کاچی گوڑہ کے نواح میں قایم کیا۔ کالج اگست 1951ء میں قایم ہوا۔ اور راج بہادر گوڑ 1952ء میں رہا ہوئے۔ پہلی بار انہیں جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے دیکھا اور سنا۔ نہایت پُر اثر لفظوں میں ان کا خطاب سب کو بھایا۔ ان دنوں گلبرگہ اسٹوڈنٹ کا ٹیج حیدرآباد میں ایک ایسا مرکز تھا۔ جہاں ہفتہ وار، ماہوار ادبی نشستوں کے علاوہ سالانہ تہذیبی اجلاس منعقد ہوا کرتے۔ حیدرآباد کے ترقی ہنداد با شعرا بھی کبھی کبھار ان جلسوں کی رونق بڑھاتے ۔ ن میں مخدوم محی الدین ، راج بہادر گوڑ، عالم خوندمیری، زینت ساجدہ، سرینواس لاہوٹی، سلیمان اریب، مغنی تبسم، کنول پرشاد، غیاث صدیقی، عزیز قیسی، عاتق شاہ شامل ہیں۔ 1959ء میں گلبرگہ میں انجمن ترقی اردو ہند کی شاخ قایم ہوئی تو راج بہادر گوڑ، سرینواس لاہوٹی اور حسینی شاہد سے روابط اور مستحکم ہوئے۔ گلبرگہ کی انجمن کو لاہوٹی کے علاوہ گوڑ صاحب کی رہنمائی حاصل تھی۔ گوڑ صاحب نے راقم الحروف کو حیدرآباد کرناٹک میں انجمن کی سرگرمیوں اور اس کی شاخوں کے قیام کی ذمہ داری تفویض کی تھی میں، بنگلور کی ریاستی انجمن کے علاوہ بیدر اور رائچور کی انجمنوں کی کارکردگی وادبا کے سلسلے میں ان کا اہم منصب بھی رہا۔

سیاسی مصروفیت کے باوجود گوڑ صاحب کا ادبی مطالعہ غیر معمولی تھا۔ کتب کے مطالعے کے بعد اپنے تاثرات کا تنقیدی مقالے و تبصرہ کی شکل میں اظہار کرتے۔ میری خواہش پر 1981 میں سید مجیب الرحمٰن کی کتاب ماورائے شعور پر ایک بسیط تنقیدی مقالہ سپردقلم کیا۔ جو گوڑ صاحب کی کتاب 'ادبی تناظر' میں شامل ہے۔ اسی طرح 1991ء میں میری کتاب 'تحقیق و تجزیہ' شائع ہوئی تو انھوں نے تبصرہ لکھا جو 'ہماری زبان' میں شائع ہوا۔

گوڑ صاحب نے زمانہ طالب علمی ہی سے لکھنا شروع کیا۔ چچا رائے محبوب نرائن گوڑ اور ان کے استاد و مشہور شاعر صدق جائسی کی محبت و تربیت کا نتیجہ ہے کہ ان میں ادبی ذوق پیدا ہوا۔ ان کی پہلی تحریر ۱۹۳۴ء میں روزنامہ پیام حیدرآباد میں شائع ہوئی جب کہ وہ ہائی اسکول کے طالب علم تھے۔ انھوں نے 1938ء میں عثمانیہ یونیورسٹی سے انٹرمیڈیٹ اور 1943ء میں عثمانیہ میڈیکل کالج سے ایم بی بی ایس کی تکمیل کی۔ میڈیسن کی تعلیم اردو کے ذریعہ ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے صرف اردو ہی میں نہیں بلکہ انگریزی میں بھی متاثر کن مضامین لکھے ان کی پہلی کتاب "Try Colour shall fly over Hyderabad" ہے۔ جو 1947ء میں شائع ہوئی۔ ان کے انگریزی مضامین کا مجموعہ "Random Writings" کے نام سے

شائع ہوا۔جس میں مخدوم، اقبال، فیض احمد فیض، پریم چند، فراق گورکھپوری، مولانا حسرت موہانی، ڈاکٹر مختار احمد انصاری اور مولانا محمد علی کے علاوہ مسلح تلنگانہ جدو جہد اور سیکولرازم پر مضامین شامل ہیں۔1975ء میں انھوں نے انگریزی میں مخدوم پر بھی ایک کتابچہ لکھا۔اردو مضامین کے تین مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔اردو کی پہلی تصنیف ''ادبی مطالعے'' انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی جانب سے 1978ء میں شائع ہوئی جس میں 13 مضامین شامل ہیں۔ان 13 مضامین میں تین مضامین مخدوم محی الدین پر ہیں۔''ادبی مطالعے'' کا پہلا مضمون اقبال پر ہے۔اس مضمون میں انھوں نے اقبال کے مطالعے کے لیے معروضی و سائنٹفک نقطہ نظر اختیار کرنے کی صلاح دی ہے۔اقبال کی عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے بعض امور میں ان سے اختلاف بھی کیا ہے۔ادبی مطالعے میں شامل ایک اور مضمون ''انیسؔ کی شاعری کا سماجی مقصد'' میں کہا ہے کہ عزاداری حسین کے نام پر محض غم کا اظہار فرار کی راہیں ہموار کرتا ہے۔انیسؔ نے بجا طور پر شاعری کے ذریعے قوم کا کردار بنانے، بہترین انسانی جذبات بیدار کرنے اور فرض کا احساس دلانے کا کام کیا ہے۔فیض کے بارے میں رقم طراز ہیں کہ انھوں نے قدیم علامتوں اور لفظیات کو نیا مفہوم عطا کیا ہے۔ جو رشید احمد جامی کے مجموعہ کلام ''رخسار سحر'' کو روایت اور اجتہاد کا حسین سنگم اور کیفی اعظمی کو انقلابی شاعری کا مشعل بردار قرار دیا ہے۔

1990ء میں دنیا پبلی کیشنز، نئی دہلی سے ان کے مضامین کا دوسرا مجموعہ ''ادبی جائزے'' شائع ہوا۔اس میں بھارت چندکھنہ، سعید بن نقش اور جیلانی بانو کی کہانیوں پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ جیلانی بانو کی کہانیوں پر اپنے تاثرات میں ان کے گہرے مشاہدے اور مظلوم عورتوں کے تئیں ان کے احساسات کو سراہا ہے۔ اردو اور سیکولر معاشرت کے علاوہ اقبال اور مخدومؔ سے لے کر فراق اور جوش تک کئی اہم ادبی شخصیتوں پر ان کے مضامین ادبی مطالعے اور ادبی جائزے میں شریک ہیں۔

''ادبی تناظر'' ان کے مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے۔جس میں 18 مضامین شامل ہیں۔یہ مجموعہ 1991ء میں انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی کی جانب سے شائع ہوا ہے۔سجاد ظہیر کی کتاب ''روشنائی'' پر ان کا مضمون نہایت اہم ہے۔ انھوں نے اس میں 1857ء سے لے کر ترقی پسند تحریک تک اردو ادب کے اہم رجحانات کا جائزہ لیا ہے اور ''روشنائی'' کو ترقی پسند تحریک کی آپ بیتی قرار دیا ہے۔اس کتاب کا دوسرا مضمون غالب اور جدید ذہن ہے۔جس میں کہا ہے کہ غالب نے ذہنی غلامی کے بت کو توڑا ہے اور یہی بت شکنی انھیں جدید ذہن کا رہنما بنا دیتی ہے۔بعض ترقی پسندوں کی طرح راج بہادر گوڑ نے غزل کی مخالفت نہیں کی بلکہ وہ غزل کو نئے تقاضوں کی ترجمان اور ارتقاء کی نئی سمتوں کی بشارت قرار دیتے ہیں۔اپنی اس کتاب میں انھوں نے مولانا آزاد، محمد علی جوہر اور سروجنی نائیڈو کے ساتھ اپنے معاصرین نیاز حیدر، مخدوم محی الدین، خواجہ احمد عباس، فضا، ابن فیضی اور بیدی کے فن کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔انھوں نے اس میں قمر جمالی کی کہانیوں پر بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔گوڑ کے مطابق قمر جمالی اپنے ہی تخلیق کردہ کرداروں سے گھل مل جاتی ہیں نیز انھوں نے اپنی متعدد کہانیوں میں عورت کی عظمت کو ابھارنے کی سعی کی ہے۔اس کتاب کا آخری مضمون ''ایک گھر جو تقسیم ہو گیا'' مصنف امرت رائے پر رائے زنی کرتے ہوئے اردو کے موقف کے بارے میں ان کی رائے سے اختلاف کیا ہے۔حب الوطنی ہندو مسلم اتحاد اور سیکولرازم پر ان کا ایقان کامل تھا۔انھیں اس بات کا احساس تھا کہ اکثریت کے ساتھ ساتھ اقلیتوں نے بھی اس ملک کی آزادی کے لیے قربانیاں دی ہیں مولانا حسرت موہانی، مولانا محمد علی اور مولانا آزاد

پر ان کے مضامین حق گوئی و بے باکی کی ترجمانی کرتے ہیں۔

شگفتگی اور بذلہ سنجی ان کے مضامین کی زبان کا نمایاں وصف ہے۔ بقول ڈاکٹر قمر رئیس، مارکسی ادیبوں کے تنقیدی مضامین کی نثر اکثر بڑی بے کیف اور خشک ہوتی ہے لیکن گوڑ کی تحریروں میں وضاحت اور روانی کے ساتھ تازگی اور شگفتگی کا احساس ہوتا ہے۔

گوڑ صاحب کی تحریروں سے نہ صرف ان کے تنقیدی زاویہ نگاہ سے آگہی ہوتی ہے بلکہ ان کی عظمت ذہنی کشادگی، بصیرت، وسعت مطالعہ، اور سلامت روی کا احساس ہوتا ہے۔ ترقی پسند تحریک سے وابستگی کے باعث وہ ادب کی مقصدیت کے حامی رہے مگر صرف مقصدیت ہی کو نہیں اس کی ہیئت، اسلوب کی خوبصورتی اور جمالیاتی حس کو بھی ضروری سمجھتے تھے۔ وہ ایک اچھے صحافی بھی تھے کمیونسٹ پارٹی کے ترجمان ''کمیونسٹ جائزہ'' کے چار سال تک ایڈیٹر رہے اور پارٹی ہی کے ہفت وار اخبار ''حیات'' میں میرا کالم کے عنوان سے باقاعدہ کالم لکھا اس کالم میں بالعموم اردو اور اقلیتوں کے مسائل پر اظہار خیال فرمایا۔

اپنے سیاسی و سماجی مقاصد کے حصول کے لیے گوڑ صاحب کئی علمی، ادبی، سماجی و سیاسی اداروں اور انجمنوں سے وابستہ رہے۔ 1939ء میں عثمانیہ میڈیکل کالج میں زیر تعلیم رہے۔ انھیں اسٹوڈنٹ یونین کے نائب صدر منتخب ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ اور جب سیاست میں داخل ہوئے تو ٹریڈ یونین اور CPI کے مختلف عہدوں پر فائز رہے۔ 1952ء سے 1962ء تک دو دفعہ راجیہ سبھا کے رکن رہے۔ انجمن ترقی اردو ہند کے دوامی رکن، دو دفعہ نائب صدر اور پھر صدر بھی رہے۔ انجمن ترقی اردو آندھرا پردیش کی بہ حیثیت نائب صدر رہنمائی کی۔ انھوں نے بہ حیثیت رکن گجرال کمیٹی اردو کے جائز حق کے لیے نمائندگی کی۔ اسی طرح سردار جعفری کمیشن کی رپورٹ لکھنے اور سفارشات مرتب کرنے میں گوڑ صاحب کا رول اہم رہا ہے۔ وہ قومی کونسل برائے فروغ اردو اور ترقی پسند مصنفین سے متعلق رہے۔ انھوں نے جہاں بندوق اٹھائے کھیتوں کھلیانوں میں کسانوں کے فوجی دستوں کی تنظیم کی وہیں صرف دکن ہی میں نہیں بلکہ کل ہند سطح پر اردو تحریک میں ایک طویل عرصے تک سرگرم رہے۔ ان کے بارے میں میں سید حامد سابق وائس چانسلر، مسلم یونیورسٹی کا یہ اظہار سند کا رجہ رکھتا ہے۔ ''جدید صنعت نے دست دولت آفریں کو جس طرح کچلا اور کچل رہی ہے راج بہادر نے اس کے خلاف جہاد کو اپنی زندگی کا مقصد بنالیا تھا''۔

میں راج بہادر گوڑ صدی تقریبات کمیٹی اور کل ہند ترقی پسند مصنفین کو مبارک باد دیتا ہوں کہ ان مجالس نے گوڑ صاحب کے اعزاز میں دو روزہ تقریب منعقد کی تاکہ ہم گوڑ فہمی کے ذریعے اپنا لائحہ عمل مرتب کریں اور ان کے بتائے ہوئے راستے پر گامزن ہوں اور سچ پوچھئے تو یہی ان کی خدمت میں سچا خراج عقیدت ہے۔ گوڑ صاحب نے جواں سالی سے پیرانہ سالی تک تقریباً 70 سال عوامی فلاح اور زبان و ادب کی خدمت کی وہ دکن کی آبرو ہی نہیں ملک کا اثاثہ تھے۔ خوش گفتار، بذلہ سنج اور جادو نگار ادیب بھی۔ وہ صاحب نظر اور صاحب طرز تھے۔ ان کی دائمی جدائی کو بھی 7 سال ہوئے وہ آج بھی ہمارے دلوں میں ہیں، ہمارے ساتھ ہیں وہ ہمارے ہر دل عزیز رہنما تھے یہ مقبولیت انھیں یوں ہی نہیں ملی بلکہ ان کے تواتر ایثار اور قربانیوں نے انھیں بے مثال کر دیا ہے۔ میرؔ نے سچ ہی کیا ہے۔

برسوں لگی ہوئی ہیں جب مہر و مہ کی آنکھیں
تب ہم سا صاحب، صاحب نظر بنے ہے

☆☆☆

حبیب نثار

مضمون

ڈاکٹر راج بہادر..... غزل، روایت اور فن

راج بہادر گوڑ کے مضامین پر مشتمل تین مجموعے شائع ہوئے ہیں ادبی مطالعے، ادبی جائزے ورادبی تناظر اس کے علاوہ ان کے بے شمار مضامین مختلف رسالوں میں شائع ہوئے ہیں اپنے رفیق دیرینہ مخدوم پر انگریزی میں ایک کتابچہ اور حیدرآباد کی تحریک کو موضوع بنا کر بہ زبان انگریزی دو کتابیں ان کی یادگار ہیں۔ انجمن ترقی اردو کے معتمد خلیق انجم نے راج صاحب کی سوانح، شخصیت اور ادبی خدمات پر ایک کتاب مرتب وشائع کی جس کی رسم اجراء اسی اردو ہال میں انجام دی گئی تھی اس کے علاوہ راج بہادر گوڑ کے نواسے کا تحریر کردہ ایک کتابچہ ''نانا'' کے عنوان سے ملتا ہے۔

میں نے اپنے اس مضمون کے لیے اردو کے تین مجموعہ ہائے مضامین کو اپنا ماخذ قرار دیا ہے۔

راج بہادر گوڑ نے اپنے بیشتر مضامین میں غزل کے فن، غزل کی روایت اور غزل گو شعرا پر کچھ ایسے جملے لکھے ہیں جو بذات خود Statement کا درجہ رکھتے ہیں۔ میں نے ایسے ہی چند Statements کو اپنے اس مضمون کے ماخذ کے طور پر منتخب کیا ہے۔ اور انہی کے معروضی مطالعہ پر یہ مضمون محیط ہے۔

راج بہادر گوڑ کے مطالعہ شعر کا نقطہ نظر بہت واضح اور دوٹوک رہا ہے۔ وہ شعر کے معنوی حسن کو محسوس کرتے ہیں اور اس کی شدت تاثیر کو شعرفہمی کے لیے ضروری اور اہم سمجھتے ہیں۔ مخدوم کے ایک شعر کے سلسلے میں اپنے ساتھی جواد رضوی سے کہتے ہیں۔

> ''جواد صاحب آپ نے شعر کو صرف پڑھا ہے محسوس نہیں کیا۔ آپ اس کے الفاظ میں الجھ گئے ہیں۔ معنوی حسن کو نہیں دیکھا۔ شدت تاثیر کا اندازہ کیجئے۔ آخر مبالغہ شعر کا حسن ہے اور بیان کا وہ انداز ہے جس سے تاثیر میں شدت پیدا ہوتی ہے۔'' (ادبی مطالعے، ص۹۳)

راج بہادر گوڑ نے یہاں شعر کی معنوی حیثیت کے بارے میں جو کچھ کہا ہے وہ انوکھا تو نہیں لیکن شعر کی روایتی تعریف سے بالکل الگ اور منفرد ضرور ہے۔

شعر کے معنوی حسن کے بعد اسے راج بہادر گوڑ سے ذرا غزل کے بارے میں ہونے والے ارشاد کو بھی سن لیں۔ فرماتے ہیں۔

> ''غزل محض عشق کی داستان یا غم عشق کا رونا نہیں''

کیسا بولتا ہوا جملہ ہے اگر کلیم الدین احمد سن لیتے تو انھیں اقلیدس کا نقطہ اور معشوق کی موہوم کمر پر زور دینے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ ۱۹۶۰ء کے بعد غزل کی جو تعریف ہمارے سامنے آتی ہے ''زخمی غزال اور اس کی آنکھ میں موجود زندگی کرنے کا ذوق وشوق اور سامنے کھڑی موت کا کرب'' نے غزل کے معنوں کو نئے وسعتوں سے آشنا کیا ہے' عابد علی عابد اور استاد محترم مغنی تبسم نے غزل کی اس نئی تعریف کو بڑے اچھے انداز میں بیان کیا ہے۔ عابد علی عابد اور مغنی تبسم، ادب کے باسی ہیں، تنقید ان کے لیے بازیچہ اطفال ہے لیکن جب راج بہادر گوڑ جیسے کامریڈ کے قلم سے غزل کی یہ توضیح بیان ہوتی ہے تو ان کی ادب فہمی کی داد دیتے ہی بنتی ہے۔

اردو غزل کی تاریخ اور روایت میں ۱۸۵۷ء کے بعد کی غزل کا ہم مطالعہ کرتے ہیں تو دہلی میں غالبؔ کے بعد اور لکھنو میں

ناسخ و آتش کے بعد غزل کی جو صورت حال ملتی ہے اسے ہم خوب جانتے ہیں کہ غزل رعایت لفظی اور الفاظ کا گورکھ دھندہ بن گئی تھی اور شعرا صنائع و بدائع کے بہانے خوب کھل کھیل رہے تھے کہ حالی نے مقدمہ شعر و شاعری شائع کیا۔ آیئے راج بہادر گوڑ سے سنتے ہیں۔

''ایک وہ زمانہ تھا جب کہ حالی نے غزل کو
مجرموں کے کٹھرے میں کھڑا کر کے نہ صرف
فرد جرم لگائی، بلکہ خوب کھری کھری سنائی، اور
بے چاری غزل جو پہلے ہی سے نحیف اور کمزور
ہوگئی تھی۔ بدن میں خون نہ تھا اور پیلی پڑ گئی
تھی۔ سر نیوھاڑے کھڑی رہی پھر حالی نے
ایک تجربہ کار طبیب کی طرح کچھ نسخے بھی تجویز
کیے کہ غزل صحت مند و توانا ہو کر اصنافِ ادب
میں اپنا کھویا ہوا امتیازی مقام پھر سے حاصل
کرے۔(ادبی مطالعہ، ص ۱۷۵)

رعایت لفظی اور لفظی بازی گری والی غزل کو راج بہادر گوڑ نے ''بدن میں خون نہ تھا اور پیلی پڑ گئی تھی۔ سے تعبیر کیا ہے اور غزل کی تاریخ کے اس دور کو بالکل صحیح الفاظ کا جامہ پہنایا ہے، ایسا نہیں ہے کہ راج بہادر گوڑ نے صرف منظر اور پس منظر ہی بیان کیا ہو انہوں نے اپنے ایک دوسرے مضمون میں اس مریضانہ غزل کے اشعار بھی درج کیے ہیں۔ ''ادبی تناظر'' میں موجود جلیل مانک پوری کے حوالے سے لکھے گئے مضمون میں ان اشعار کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے جہاں انہوں نے ناسخ کے تین شعر، آتش کے دو شعر اور وزیر، بحر اور امانت کے اشعار کے ذریعہ اپنے دعویٰ کی دلیل پیش کی ہے۔ وزیر، بحر اور امانت کی غزل پر اظہار خیال کرتے ہوئے راج بہادر گوڑ نے ایک عجیب سی بات لکھی ہے لیکن یہ بات بڑی معنی خیز ہے آپ بھی سنئے لکھتے ہیں۔

''ذرا سوچئے تو سہی اگر حالی اپنی مشہور نظم ''مدوجذر
اسلام'' مسدس کی بجائے غزل کے انداز میں لکھتے
تو آپ اور میں نہ حالی کو جانتے نہ مسدس کو پہچانتے
اور شاید غزل کو بھی کوسنے لگتے''۔

دراصل موضوع اور ہیئت کی باہمی یگانگت کی وضاحت کے سلسلے میں انھوں نے مسدس کی مثال دی ہے۔ ان مثالوں سے یہ مت سمجھ لیجئے کہ راج صاحب غزل اور اس کے مضامین کے مخالف تھے نہیں انہوں نے تو غزل پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے۔

''غزل دریا کو کوزے میں بند کر سکتی ہے۔ غزل
میں گہرائی بھی ہے اور گیرائی بھی''
(ادبی جائزے، ص ۱۵۶)

راج صاحب نے اپنے مضامین میں غزل کے دریا کو کوزے میں بند کرنے اور اس کے مضامین کی گہرائی اور گیرائی کی سند میں اشعار بھی لکھے ہیں۔ چند شعر انھیں کے مختلف مضامین سے یہاں پیش کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خود بیں ہیں کہ ہم
الٹے پھر آئے، در کعبہ اگر وانہ ہوا
غالب

گل ہیں قندیل حرم، گل ہیں کلیسا کے چراغ
سوئے پیمانہ بڑے دستِ دعا آخر شب
مخدوم

حسن دیکھا جو بتوں کا تو خدا یاد آیا
راہ کعبے کی ملی ہے مجھے بت خانے سے
جلیل مانک پوری

کسی معصوم بچے کے تبسم میں اُتر جاؤ
تو شاید یہ سمجھ پاؤ کہ خدا ایسا بھی ہوتا ہے

ظفرؔ گورکھپوری

خودشناسی کے لیے ٹوٹنا لازم ہے ظفر
آئینے کو کسی پتھر کے حوالے کر دو

ظفرؔ گورکھپوری

چمک رہی ہیں تبسم کے کرب سے آنکھیں
یہ کس شراب سے پیمانہ بھر گیا ہے کوئی

فضا ابن فیضی

راج بہادر گوڑ کے پہلے مجموعے مضامین میں ایک طویل مضمون مرثیہ سے متعلق ملتا ہے اس مضمون میں قابل مضمون نگار نے صوفیاء کی ادبی خدمات کا بھی احاطہ کیا ہے۔ اردو شعر وسخن کو صوفیا نے جو اصطلاحیں اور علامتیں دی ہیں ان پر اظہار خیال کرتے ہوئے چند کی تعریف وتوجیح بھی کی ہے۔ اقتباس دیکھئے۔

''صوفی ادیبوں نے زبان کو کئی اصطلاحیں اور علامتیں بخشیں، جب وہ بت کدہ، بت خانہ، شراب خانہ، خرابات وغیرہ کہتے ہیں تو اس سے عارفِ کامل کا باطن مراد لیتے ہیں، پیر مغاں ، پیر خرابات، مرشد کو کہتے ہیں، مئے سے مراد وہ ذوق ہے جو سالک کے دل میں پیدا ہوتا ہے''۔

جواد رضوی کو راج صاحب نے معنوی حسن کو پرکھنے کی تلقین کی تھی اس اقتباس کی شان بھی اسی معنوی حسن پر ٹوٹتی ہے۔ آج کتنے طالب علم ایسے ہیں جو ان اصطلاحوں کے صحیح مفہوم سے واقف ہیں۔ راج بہادر اردو ادب کے عاشق صادق تھے۔ ڈاکٹر عبدالعلیم کہتے ہیں۔

''ادبی تنقید کا مقصد یہ ہے کہ ادب کو پڑھنے والوں کے نقطہ نظر سے دیکھا جائے''

میں نے راج بہادر گوڑ کے نقطہ نظر کو سمجھنے کی ایک کوشش کی ہے۔ اس تمام اجمال کے بعد یہ احساس ہوتا ہے کہ راج بہادر گوڑ کے یہ ارشادات و خیالات کسی بھی تنقیدی شہ پارے کے مقابل رکھے جاسکتے ہیں۔

☆☆☆

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زورؔ

کے نامور شخصیات پر لکھے گئے مضامین
کا مجموعہ

افاداتِ زور

(جلد چہارم)

مرتب
سید رفیع الدین قادری

ملنے کا پتہ:
زور فاؤنڈیشن، زور کامپلکس، پنجہ گٹہ حیدرآباد
ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی۔۶
ایوانِ اردو، پنجہ گٹہ روڈ، سوماجی گوڑہ، حیدرآباد۔۸۲

محبوب خاں اصغر

رپورتاژ

انجمن ترقی پسند مصنفین کے زیر اہتمام ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی صد سالہ تقاریب

ہندوستان کی دیگر ریاستوں کے مقابل ریاست تلنگانہ میں حیدرآباد اپنی برسوں قدیم گنگا جمنی تہذیب کے لیے مثالی رہا ہے۔ آپسی بھائی چارہ' باہمی خلوص وتعاون' رواداری' ہمدردی 'اخوت اور محبت نے ہمیشہ ہی یہاں روشنی بکھیری ہے۔ انسانی اور اخلاقی معیار کو ابھارنے کے لیے ہندو' مسلم' سکھ' عیسائی نے شانہ بہ شانہ کام کیا ہے اور یہی شاندار ماضی ہمارا سب سے بڑا سرمایہ ہے۔ جن اسلاف کے شاندار کارنامے ہمارے اندر جہد' اصلاح اور خود اعتمادی پیدا کرتے ہیں ان میں ایک اہم نام آنجہانی ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا ہے جو 21 جولائی 1918 کو پیدا ہوئے۔ اگر حیات ہوتے تو 21 جولائی 2018 کو سو برس کے ہوتے۔ مگر موت کا ایک دن معین ہے کہ مصداق وہ اپنی صدی مکمل کرنے سے قبل ہی دنیا سے سدھار گئے۔ مگر عین اسی موقع پر انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنی عملی زندگی میں ظریف مزاج اور زندہ دل انسان وممتاز عثمانین کی یاد میں تین روزہ صدی تقاریب کا اہتمام بڑے ہی تزک واحتشام سے منانے کی ٹھان لی۔ چنانچہ 21 جولائی 2018 ہفتہ کی شام چھ بجے اس کی افتتاحی تقریب شہر دل میں واقع تہذیبی وثقافتی مرکز زبان اردو سے موسوم اُردو ہال حمایت نگر میں منعقد ہوئی۔ صدارت پروفیسر بیگ احساس سابق صدر شعبہ اردو جامعہ عثمانیہ وحیدرآباد سنٹرل یونیورسٹی اور صدر (Progressive Writers Association) انجمن ترقی پسند مصنفین نے فرمائی ۔صدر استقبالیہ کی حیثیت سے محترم زاہد علی خان صاحب مدیر اُردو روز نامہ ''سیاست'' نے گفتگو کا خوشگوار آغاز کیا اور کہا کہ راج بہادر گوڑ جری' ذکی الفہم اور حوصلہ مند انسان تھے۔ ان کے فکر وعمل سے ان کے ہمنواؤں کو کبھی بھی اختلاف نہیں رہا۔ اختلاف اسی وقت سر اٹھاتا ہے جب ذاتی مفاد کو اہمیت دی جانے لگتی ہے۔ انہوں نے کہا کہ گوڑ صاحب کے پیش نظر مفاد عامہ رہا۔ ان کے شب وروز اسی فکرواضطراب میں گذرتے تھے کہ کس طرح عوام کی خستہ حالی کو دور کیا جاسکتا ہے۔ تعلیم کو عام کرنا اور اس کے حصول کے لیے پیش رفت کی راہوں کو آسان بنانا ان کی زندگی کا عین مقصد تھا۔

جناب زاہد علی خان صاحب نے بتایا کہ گوڑ صاحب ہو کہ مخدوم' عابد علی خان صاحب ہو کہ محبوب حسین جگر' منوہر راج سکسینہ ہو کہ ڈاکٹر منان یا ڈاکٹر زینت ساجدہ تعلیم کی روشن صداقتوں کو بخوبی سمجھتے تھے اور چاہتے تھے کہ علم کی روشنی سے سب ہی بہرہ مند ہوں۔ مدیر سیاست نے سردست حکومت تلنگانہ سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ مخدوم محی الدین کے طرز پر اُردو اکیڈیمی تلنگانہ راج بہادر گوڑ سے ایک ایوارڈ موسوم کرے تاکہ آنے والی نسلیں راج بہادر گوڑ کی اُردو کے تیئں خدمات سے واقف ہوسکے اور یہ اقدام نئی نسل کو سلف سے جوڑے رکھنے میں معاون ثابت ہوسکتا ہے۔ انہوں نے اپنے خطاب میں اس بات کا بھی اظہار کیا کہ مختصر سی سیاسی زندگی میں لوگ متمول بن جاتے ہیں مگر گوڑ صاحب اپنی صاف شفاف زندگی کے لیے آج بھی یاد رکھے جاتے ہیں۔ بہ یک وقت سرگرم سیاستداں' ٹریڈ یونین لیڈر' ادیب' شاعر اور مصنف ہونے کے باوجود ان میں اکڑ بازی نہیں تھی۔ سیاسی بصیرت اور تعلیمی آگہی نے ان کے اندر مثبت انداز فکر پیدا کیا تھا۔ اصلاحی افکار ونظریات نے ان کی شخصیت میں ایک عجیب طرح کی کشش پیدا کردی تھی۔ مزاج قلندرانہ پایا تھا۔ اردو کی سرگرمیوں کو فروغ دینے کے لیے بس کا سفر کرکے اضلاعوں کا دورہ کرتے۔ خدمات کے عوض ملنے والی رقم کو انہوں نے اُردو کی فلاح و بہبودی کے لیے وقف کردی۔

پروفیسر ایس وی ستیانارائنا نے اپنی گرج دار آواز میں

راج بہادر گوڑ صدی تقاریب میں چھائی ہوئی خاموشی پر حرف رکھا اور کہا کہ سامعین کا انداز گوڑ صاحب کی شایان شان نہیں ہے۔

ظرافت اور خوش طبعی ان کے مزاج کا جز تھی۔ مگر غور وفکر متانت اور سنجیدگی بھی ان کی ذات کا حصہ تھی۔ انہوں نے کہا کہ گوڑ صاحب کو اپنی مادری زبان کے ساتھ اُردو اور انگریزی زبان پر بھی عبور حاصل تھا۔ مختلف زبانوں کی کتب بینی نے ان کی شخصیت کو بحر بیکراں بناڈالا تھا۔ مزید برآں انہوں نے گوڑ صاحب کی بے تکلفی اور برجستگی کا ذکر کرتے ہوئے ان کی کثیر الجہت شخصیت کا خوش سلوبی سے تذکرہ کیا۔

جناب غلام یزدانی صدر انجمن ترقی اُردو و برتر وکیل نے اپنے خطاب میں عبقری شخصیتوں کی رحلت کر جانے پر گہری تشویش کا اظہار کیا اور کہا کہ گوڑ صاحب کی اسپرٹ کو زندہ رکھنا از حد ضروری ہے۔ سردست انہوں نے اُردو ہال کی قدیم ادبی تقاریب کا ذکر کیا جس میں شرکاء کی قابل لحاظ تعداد بڑے ہی صبر وتحمل سے اکابرین کی خطابات سماعت کرتی تھی۔ شرکاء کی گھٹتی ہوئی تعداد پر اظہار تفکر کرتے ہوئے انہوں نے گوڑ صاحب سے متعلق کہا کہ وہ جس عہد میں پیدا ہوئے وہ جنگوں کا عہد تھا۔ لسانی جھگڑے چل رہے تھے۔ غیر منقسم ہندوستان سے لے کر پاکستان بننے تک ان کی آنکھوں نے زمانے کا بدلنا دیکھا۔ تغیرات کی تیز آندھی میں ان کا بچپن پروان چڑھا۔ ان کی عملی زندگی کا آغاز نلگنڈہ کی پہاڑیوں سے ہوا۔ مخدوم اور گوڑ ایک دوسرے کے لازم وملزوم رہے۔

پروفیسر علی جاوید دہلی یونیورسٹی نے مائک سنبھالا اور اُردو کے ساتھ روا سلوک پر بات کرتے ہوئے کہا کہ اُردو کی بدقسمتی یہ ہے کہ ہم اس کے حق کی بات کرتے ہیں۔ انتخابات کے دوران اُردو کو اس کا مستحقہ مقام دلانے کی بات کی جاتی ہے پھر اس کے بعد اُردو کا کوئی پرسان حال نہیں ہوتا۔ اُردو کو مشترکہ تہذیب کی امین کہتے ہوئے انہوں نے کہا کہ اس کو مذہب سے جوڑنا غلط ہے۔ انہوں نے بتایا کہ فارسی کا عوام سے تعلق نہیں تھا۔ اردو متبادل کے طور پر سامنے آئی۔ اُردو عوام کی پسندیدہ زبان ہے جس میں بہت طاقت ہے۔ غالب کو اپنے فارسی کلام پر ناز تھا مگر غالب کو اُردو ہی کی وجہ سے جانا جاتا ہے۔ اس زبان کو مسلمانوں تک محدود کر دیا جائے تو رتن ناتھ سرشار' پریم چندر' جگن ناتھ آزاد' رتن سنگھ' جوگندر پال' بیدی' کرشن چندر اور ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کہاں جائیں گے؟۔ گوڑ صاحب نے بلاکسی مذہب اور تفریق کے اردو کو حق دلانے کی بات کہی تھی۔ انجمن ترقی پسند مصنفین نے تمام زبانوں کو لے کر انگریزوں سے آزادی کا مطالبہ کیا۔ اس مطالبے کو بروئے کار لانے میں اُردو کے رول سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ گوڑ صاحب اردو وراثت کے امین تھے۔ برگزیدہ تھے۔ اپنے کمٹمنٹ سے برگشتگی ان کے خمیر میں نہیں تھی۔ انہیں اپنی علمیت کا رعب بھی نہیں تھا۔ انہوں نے موجودہ عہد کی سیاست کے بارے میں کہا کہ آج سیاست کمٹمنٹ نہیں ہے۔ تجارت میں تبدیل ہوگئی ہے۔ اقتدار کے حصول کے لیے ہر وہ حربے استعمال ہونے لگے ہیں جس سے انسانیت بھی شرمسار ہو جائے۔ انہوں نے کہا کہ گوڑ صاحب کو مجاہد آزادی کے طور پر جاننے اور دیکھنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کمیونسٹ پارٹی کے لیے جو ایثار کیا ہے اس کے صلے کی کبھی تمنا نہیں کی۔ اپنے کردار کے بدلے میں کچھ نہیں چاہا۔ وہ اس بات پر بہت کڑھتے تھے کہ اُس زمانے میں بھی کئی فریڈم فائٹر انگریزوں کے مخبر تھے جو پارٹی کو کمزور کرنے کرنے کے درپے تھے۔ انہوں نے یہ انکشاف بھی کیا کہ حکومت وقت نے انہیں پنشن کا آفر دیا تھا جسے انہوں نے قبول نہیں کیا۔

صاحب بصیرت وصاحب نظر جناب علی جاوید نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ آج ہر کوئی مرعوب ہو جانے کی علت میں ہے۔ حقائق کا اظہار کرنے سے خوف آتا ہے۔ انہوں نے سوال داغا کہ کیا آج ہم میں سچ کو سچ کہنے کا حوصلہ ہے؟۔ انگریزوں سے آزادی کا جو مقصد تھا۔ کیا وہ پورا ہوا۔؟

آج بڑی بڑی کمپنیوں کے دلال ملک سے محبت کے نام پر ہمارے ذہنوں کو آلودہ کررہے ہیں۔ ان حالات میں مصنفین کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔انہوں نے اس بات پرزور دیا کہ گوڑ صاحب کی تحریک کو آگے بڑھا کر ہی ہم انہیں خراج عقیدت پیش کرسکتے ہیں۔

جناب احمد عالم خان صاحب نے اپنی تقریر میں بتایا کہ وہ اپنے والد بزرگوار جناب شاہ عالم خان صاحب مرحوم سے گوڑ صاحب کا نام سنا کرتے تھے۔تحسین آمیز کلمات سن کرانہیں اس بات کا اندازہ ہوگیا ہے کہ وہ گنگا جمنی تہذیب کے علمبردار ہیں۔انہیں حیرت بھی ہوا کرتی تھی کہ ایک شخص مجمع صفت کیسے ہوسکتا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ گوڑ صاحب کی جسد خاکی کوان کی وصیت کے مطابق عثمانیہ میڈیکل کالج کے حوالے کیا گیا۔

ممتاز جہد کار ودانشور جناب پی نرسنگ راؤ جنہیں ہرتحریک میں گوڑ صاحب کے کندھے سے کندھا ملا کر چلنے کا اعزاز حاصل ہے کہا کہ گوڑ اور اُردو کو علحدہ کرکے نہیں دیکھا جاسکتا۔ وہ اردو کو اپنی مادری زبان مانتے تھے۔ جب گوڑ صاحب سے ان کی ملاقات ہوئی تھی تو وہ کمسن تھے۔ان کی طالب علمی کا زمانہ تھا اور گوڑ صاحب میڈیکل کالج میں تھے کہیں نہ کہیں درشن ہوجاتے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ مخدوم اور گوڑ کے نام پر ہزاروں لوگ جلسے میں اکھٹے ہوتے تھے۔اپنی متواتر قربانیوں سے گوڑ صاحب نے ایک تاریخ رقم کی ہے۔ حالات سے براہِ راست نبرد آزما ہونے میں انہیں لطف آتا تھا۔ ایک پورے عہد کی کشمکش کا نام راج بہادر گوڑ ہے۔ وہ حالات کے مقابلے ایک مجاہد کی طرح سینہ سپر در ہے۔قوم کی اقتصادی اور معاشی سطح کو اوپر لانے کی ہمیشہ انہیں فکر رہی۔

جناب سید عزیز پاشاہ سابق ایم پی راجیہ سبھا وسرپرست انجمن ترقی پسند مصنفین نے اپنی تقریر کی شروعات ہی میں گوڑ صاحب کو مدبر، مفکر، سیاستداں اور ٹریڈ یونین لیڈر کہتے ہوئے بتایا کہ آنجہانی گوڑ صاحب سے ان کی رفاقت چار دہوں کو محیط ہے۔انہوں نے بتایا کہ میڈیکل میں ان کی دلچسپی تھی مگر گوڑ صاحب ایم بی بی ایس ہونے کے بعد بھی پارٹی کیلئے کام کررہے تھے تو وہ بھی گوڑ صاحب کے ساتھ ہولیئے۔ کئی دفعہ انہیں اپنے رفیق کے گھر جانا ہوا۔ انہوں نے دنیاوی آسائش سے خود کو مبّرا رکھا۔عوام کے ساتھ ان کی ہمدردی فطری تھی۔ یہی وجہ ہوسکتی ہے کہ ہنگامہ خیز حالات میں بھی وہ پرسکون دکھائی دیتے تھے۔انہوں نے اس شعر پر اپنی گفتگو ختم کی۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں دیدہ ور پیدا

جناب این نرسمہا ریڈی وزیرداخلہ جوخود بھی ٹریڈ یونین لیڈر ہیں کہا کہ وہ 1978ء میں ایم ایل اے مقرر ہوئے۔اور آشیرواد کے لیے گوڑ صاحب کے گھر گئے۔ وہ بڑے ہی تپاک سے ملے اور گلے لگاتے ہوئے خوشی کا اظہار کیا۔انہوں نے برجستہ کہا کہ ٹریڈ یونین لیڈروں میں گوڑ صاحب کا ثانی نہیں ہے۔ سی پی آئی اور دوسری پارٹیوں نے ان کی صدسلہ تقاریب کا اہتمام کیا ہے جس سے انکا ادبی اور سیاسی قد ظاہر ہورہا ہے۔انہوں نے بتایا کہ ٹریڈ یونین لیڈر کو انتظامیہ خریدنے کی کوشش کرتا ہے۔ساز باز میں بڑی منفعت ہوسکتی ہے لیکن انہوں نے ہمیشہ مزدوروں کا ساتھ دیا۔ ان کے مسائل پر گفتگو کی۔اس لیے وہ مزدوروں کے دلوں میں زندہ ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی اور معاشی پستی کو اپنی گفتگو کا محور بناتے ہوئے موجودہ حکومت کی پالیسیوں کا اجمالی جائزہ پیش کیا۔اور بتایا کہ ریسیڈینشل اسکول کی کشادگی کے بعد حکومت فی طلباء ایک لاکھ پچیس ہزار روپے کا خرچ برداشت کرتی ہے۔ انہوں نے گوڑ صاحب سے متعلق کہا کہ وہ ایک نیک صفت انسان تھے اور جس پارٹی سے خود کو وابستہ کررکھا تھا وہ پارٹی بھی بدعنوانیوں سے پاک ایک شفاف پارٹی تھی۔ گوڑ صاحب مرکر بھی امر ہیں۔زندہ ہیں۔

آل انڈیا پروگریسیو اسوسی ایشن کے جنرل سکریٹری

راجندر راجن نے سرزمین حیدرآباد کی تاثیر بیان کی اور کہا کہ انیس سال کی عمر میں گوڑ صاحب کو دیکھا تھا۔انہوں نے منتظمین کو مبارک باد پیش کرتے ہوئے گوڑ صاحب کی کثیر الجہت شخصیت کو سامعین کے سامنے پیش کیا اور کہا کہ گوڑ صاحب کی دوراندیشی، شعور آگہی اور علم وحکمت سے وہ ذاتی طور پر متاثر تھے۔وہ بظاہر پیرانہ سالی کی طرف مائل نظر آتے تھے مگر ان کے قویٰ ضعیف نہیں تھے۔ان کے مزاج میں اعتدال تھا۔ ڈاکٹر بن کر بیمار کا علاج کرنے سے بہتر انہیں یہ لگا کہ لیڈر بن کر مفلس اور غریبی کا علاج کریں۔ ہر تحریک سے وابستہ رہے اور خود کو سرگرم اور فعال رکھا۔جیل گئے۔ صعوبات برداشت کیں مگر ان کی آنکھوں میں ملک کا بہترین مستقبل تھا۔

پروفیسر بیگ احساس نے اپنے صدارتی خطاب میں پیشرو مقررین کی گفتگو کا جائزہ لیا۔ انہیں مبارک باد پیش کرتے ہوئے جناب زاہد علی خان صاحب کی تجویز سے اتفاق کیا اور کہا کہ راج بہادر گوڑ کے نام سے موسوم ایوارڈ سیاسی، ادبی اور ہمہ جہت شخصیت کو دیا جانا چاہئے۔

انہوں نے گوڑ صاحب کی شخصیت کا ایک متاثر کن پہلو کو بھی اجاگر کیا اور کہا کہ گوڑ صاحب کے ہاں لطائف کا خزانہ تھا۔ وہ جلسوں میں بڑی خاموشی سے آتے۔اور آٹو منگوا کر چلے جاتے۔ انہوں نے بتایا کہ گوڑ صاحب نے تقویٰ کو کمیونزم کا رنگ دیا تھا۔ ان کے ہاں صوفیوں اور فقیروں کی سی سادگی تھی۔ مستغنی تھے۔ انہوں نے اردو، فارسی، تلگو کسی تعصب کے بغیر سیکھنے کی ترغیب دلائی اور کہا کہ غیر مسلم ادیب اور شاعر پرانی نسلوں میں بھی تھے۔موجودہ نسل میں بھی ملتے ہیں جنھوں نے اُردو کو اپنے اظہار کا ذریعہ بنایا۔ انہوں نے بالاجی گوڑ اور شثی نارائن سوادھین کے غیر متوقع طور پر گذر جانے پر افسوس کا اظہار کیا۔ دومنٹ کی خاموشی منائی گئی۔

22/جولائی اتوار کا اجلاس دوحصوں پر مشتمل تھا۔ پہلے حصّے کی مجلس صدارت میں جناب تراب الحسن آئی اے ایس، محترمہ لکشمی دیوی راج اور جناب محمد عبدالرحیم خان جنرل سکریٹری انجمن ترقی اردو (ہند) تلنگانہ اسٹیٹ شامل تھے جبکہ جناب سی ایچ ہنمنت راؤ، ڈاکٹر وہاب عندلیب، جناب شاہد حسین زبیری، پروفیسر حبیب نثار اور ممتاز فکشن نگار محترمہ قمر جمالی مقالہ نگاروں میں شامل تھے۔جناب ایس اے رؤف جنرل سکریٹری انجمن ترقی پسند مصنفین نے اجلاس کی کاروائی کا آغاز کرتے ہوئے قمر جمالی کو مدعو کیا۔ انہوں نے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سے اپنے روابط کا تفصیلی ذکر کرتے ہوئے ایک روز قبل ہوئے افتتاحی اجلاس کے حوالے سے کہا کہ عمائدین نے جس انداز سے گوڑ صاحب کا ذکر کیا تھا وہ معلومات افزاء رہا۔قمر جمالی صاحبہ نے مشاہیر کے مضامین سے جو اقتباسات پیش کئے انہیں سن کر سامعین کو اس بات کا انداز ہوا کہ جناب گوڑ صاحب مرحوم ایک ایسی شخصیت کا نام تھا جن کے قول وفعل میں تضاد نہیں تھا۔ وہ ایک خاص جذبہ خلوص کے حامل تھے۔ اطراف وکناف میں ذہنی بیداری کے متمنی تھے۔قمر جمالی نے بتایا کہ گوڑ صاحب کا مولد ومسکن حیدرآباد دکن ہی رہا۔1918 میں پیدا ہوئے۔ 1936ء میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ 1938ء میں عثمانیہ میں داخلہ لیا اور 1943ء میں ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کی۔تاریخ کے استاد سے متاثر تھے۔صدق جائسی اور رائے نارائن محبوب نے ادب عالیہ کا شوق پیدا کیا۔ دنیاوی علوم کے ساتھ مذہبی تعلیم کو بھی اہم گردانا۔یکجہتی کے علمبردار تھے۔انہوں نے گوڑ صاحب کو ان کے مقام اور مرتبے سے ہم آہنگ ہو کر دیکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔

جناب شاہد حسین زبیری نے بتایا کہ گوڑ صاحب نے شعوری طور پر ایک عام آدمی کی طرح زندگی گذاری باوجود اس کے کہ وہ عام آدمی قطعاً نہیں تھے۔انہیں اردو سے والہانہ رغبت تھی اور خود کو دولت سے دور رکھا تھا۔راجیہ سبھا کے رکن کے زمانے میں انہیں بقایا جات ملے تو اس کثیر رقم کو اپنے گھر پر نہیں رکھا بلکہ اسے

اردو ہال میں تعلیمی ٹرسٹ کے استحکام کیلئے دیدیا۔ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ تحریک کے محترک کارکن تھے۔ انہوں نے تلنگانہ موومنٹ کے دوران ایک سخت ترین دور کو برداشت کیا۔زبیری صاحب نے کہا کہ تہذیب کی اصل قدروں کو دیکھنا ہوتو گوڑ صاحب کی زندگی کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ جناب شمیم فیضی چیرمین انجمن ترقی پسند مصنفین اور مدیر''حیات'' نے اپنی نپی تلی تقریر کی ابتداء کی اورکہا کہ انہیں پارٹی ہیڈکوارٹر میں گوڑ صاحب کے ساتھ لگ بھگ تین دہے کام کرنے کا موقع ملا تھا۔ان کی کام کی تیز رفتاری سے متاثر شمیم فیضی نے بتایا کہ کام کو پایہ تکمیل تک پہنچانا ان کا مقصد ہوا کرتا تھا۔فرائض کی ادائیگی میں وہ بیحد سنجیدہ تھے۔ٹریڈ یونین کے کارکنوں میں ذہنی بیداری لائی۔ اُردو کے متعلق غیر مواقف بات سننے کے لیے ہرگز آمادہ نہیں ہوتے۔ان کا اصرار تھا کہ دیگر ریاستوں کی طرح اُردو کو دفعہ 345اور 347 کے تحت تسلیم کیا جائے۔انہوں نے اس بات کا بھی اظہار کیا کہ گوڑ صاحب نے مقبول عام رسالہ''حیات''(دہلی) میں میرا کالم کے تحت ایک سوساٹھ مضامین لکھے۔دریں اثناءانہوں نے یہ بھی انکشاف کیا کہ گوڑ صاحب نے ان کی ادارت میں شامل ہونے والا ماہنامہ کمیونسٹ ڈائجسٹ میں چھ سال تک اداریئے لکھے۔جونظریاتی بنیاد پر تھے۔مختلف ادبی تصانیف پر ان کے تبصرے بھی خاص اہمیت رکھتے ہیں۔ سردست انہوں نے موجودہ حالات کو اپنی گفتگو کا موضوع بنایا اور کہا کہ ملک کا نظام ٹھوس عقلی بنیادوں پر نہیں چل رہا ہے۔فرقہ واریت کی بنیاد پر ملک کو بانٹنے کی کوشش کی جارہی ہے اور تمام وسائل کو تفرقہ کے لیے بروئے کار لایا جارہا ہے۔گوڑ صاحب جیسے وسیع النظر' کشادہ قلب اور بلند خیال لوگوں کی ضرورت کل سے زیادہ آج ہے۔

پروفیسر حبیب نثار صدر شعبہ اردو یونیورسٹی آف حیدرآباد نے ایک علمی مضمون بعنوان''راج بہادر گوڑ غزل' روایت اور فن'' پیش کیا۔ اور بتایا کہ مضامین پر مشتمل گوڑ صاحب کی تصانیف ہیں۔ادبی مطالعہ' ادبی جائزے اورادبی اصناف۔ان کے علاوہ وہ گوڑ صاحب کے بے شمار مضامین مختلف رسالوں کی زینت بھی بنے۔ان کے مضامین الفاظ کی بندش' نئی تراکیب' اور دلچسپ فقروں سے مزین ہونے کے سبب قاری میں اکتاہٹ پیدا نہیں کرتے۔ پروفیسر حبیب نثار نے دلیل کے طور پر گوڑ صاحب کے مضامین کی کئی سطروں کو پیش کیا۔

جناب وہاب عندلیب (گلبرگہ) نے بتایا کہ 1959ء میں گلبرگہ میں انجمن ترقی پسند مصنفین کی شاخ کا قیام عمل میں آیا تو گوڑ صاحب اوران کے مابین روابط کو استحکام ملا۔سیاسی مصروفیت اور دیگر امور کی ذمہ دارانہ طور پر تکمیل کے بعد اردوادب کا مطالعہ کرنا اُن کی عادت تھی۔مغرب کے مشہور مصنفوں کی کتابیں بھی ان کے زیر مطالعہ رہیں اوراسی عادت نے انہیں عقل منداور دانا بنادیا تھا۔روشن خیالی ان کی ذات کا جز تھی۔ ادبی کتب کے مطالعہ کے بعد تنقیدی جائزہ پیش کرنے میں انہیں مہارت حاصل تھی۔ وہ ایک صاحب نظر اور صاحب طرز ادیب تھے۔ان کی مقبولیت تواتر ایثار کا نتیجہ ہے اوران کی دائمی جدائی ان کے مداحوں کے لیے ایک سانحہ ہے۔صدی تقاریب کا اہتمام کئے جانے پر انہوں نے تمام ذمہ داروں کو مبارک باد پیش کی اور کہا کہ حیدرآبادیوں نے ان تقاریب میں شرکت فرما کر ایک تہذیبی روایت کو فروغ دیا ہے۔

مجلس صدارت میں شامل جناب محمد عبدالرحیم خان نے اپنی تقریر میں بتایا کہ اُردو ہال نشان اُردو ہے۔اُردو ہال کے نام کے ساتھ یاد رفتگاں وابستہ ہے۔کیسی کیسی عبقری شخصیتوں نے یہاں قدم رنجا فرما کر محفلوں کی رونق بڑھائی ہے۔ بلکہ وہ خود رونق محفل ہوا کرتے تھے۔ان میں ڈاکٹر راج بہادر گوڑ سرفہرست ہیں۔انہوں نے اس بات پر اظہار تاسف کیا کہ انجمن ترقی اُردو کی تحریکیں معدوم ہوچکی ہیں۔ اور بھی دیگر انجمنیں کارگر نہیں ہیں۔ انہوں نے سوال اٹھایا کہ تحریکیں ابھر کر کمزور کیوں پڑجاتی ہیں۔شاید

اس کی وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ اس کے محرک ملک عدم سدھار جاتے ہیں یا نقل مقام کے سبب ماتحتین تساہل کا شکار ہوجاتے ہیں۔

انہوں نے راج بہادر گوڑ کے حوالے سے اُردو ہال کی وقعت کو ظاہر کرتے ہوئے کہا کہ درحقیقت یہ خلیفہ عبدالحکیم کا مکان تھا جو فلسفہ کے پروفیسر تھے۔ وہ لاہور سے تشریف لائے تھے۔ علامہ اقبال کے ساتھی تھے۔ لاہور روانگی سے قبل انہوں نے اپنا مکان فروخت کردیا جسے پروفیسر حبیب الرحمٰن نے خریدلیا جو کہ ان کے ہم منصب تھے اور اکنامکس کے استاد تھے۔ اوراس مکان کو اردو کے فروغ کے لیے وقف کردیا۔

گلشن حبیب اردو ہال سے کئی تحریکیں شروع ہوئیں۔ جن میں ادب کے جغادریوں نے شرکت کی۔ ضلعی سطحوں پر گوڑ صاحب کے ہمراہ سفر کرنے والے جناب رحیم خان جو صدارتی خطاب فرما رہے تھے بتایا کہ گوڑ صاحب کا شریفانہ ذہن تھا۔ مظلوموں کی خلوص دل سے مدد کرنا ان کا شعار تھا۔ ادیبوں ،شاعروں کے دلجو تھے اوران کے قدردان تھے۔

محترمہ لکشمی دیوی راج سماجی جہد کار اور فنون لطیفہ کی دِلداہ ہیں۔ انہوں نے تنگی وقت کو ملحوظ رکھتے ہوئے کہا کہ آندھراپردیش سے وابستہ لوگوں سے سڑکیں موسوم کی جاتی ہیں گوڑ صاحب کے نام سے بھی کوئی سڑک یا محلّہ موسوم کیا جانا چاہئے۔

جناب تراب الحسن آئی اے ایس نے کہا کہ ان کے والد پنجتن صاحب کا گھر راج کا گھر تھا۔ راج اپنی خوش مزاجی سے سب کو اپنا گرویدہ بنالیتے تھے۔ ان کے عزائم وسیع تھے۔ ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی مگر پیشہ طب اختیار نہیں کیا۔ ان کا خیال تھا کہ ڈاکٹر بن کر مسیحائی تو کی جاسکتی ہے مگر سماجی برائیوں کا خاتمہ نہیں کیا جاسکتا۔ دراصل وہ مزدوروں کی بدحالی، زمینداروں کے ظلم کا خاتمہ چاہتے تھے جس کے لیے انہوں نے خود کو کئی تنظیموں سے جوڑے رکھا۔ انتشار اور بدحالی کے زمانے میں بھی راج نے جو کارہائے گراں قدر کی انجام دہی کے لیے خود کو وقف کیا وہ ان ہی کے لیے مخصوص ہے اور ایسی نابغہ روزگار ہستیاں کبھی کبھار ہی پیدا ہوئی ہیں۔

ٹھیک دو بجے پرتکلف ظہرانہ سے فراغت کے بعد دوسرا سیشن شروع ہوا۔ پروفیسر اشرف رفیع سابق صدر شعبہ اُردو جامعہ عثمانیہ اور ڈاکٹر علی جاوید (دہلی) مجلس صدارت میں شامل تھے۔ محترمہ قمر جمالی نے خوش اسلوبی سے اجلاس کی کاروائی کا آغاز کرتے ہوئے بتایا کہ مقالہ نگار جناب سی ایچ ہنمنت راؤ رجانسلر یونیورسٹی آف حیدرآباد سابق رکن پلاننگ کمیشن ناسازی صحت کے باعث شریک نہیں ہوسکے۔ تاہم انہوں نے اپنا مضمون بعنوان'' بزرگ مجاہدی آزادی مقبول مزدور یونین قائد اور اُردو کی ممتاز شخصیت'' روانہ کیا تھا ۔انگریزی زبان میں لکھے ہوئے اس مضمون کا ترجمہ پروفیسر سید خواجہ معین الدین صاحب نے کیا تھا جسے پروفیسر بیگ احساس صدر انجمن ترقی پسند مصنفین نے پڑھ کر سنایا۔

انہوں نے لکھا تھا کہ ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کی زندگی کا نصف صدی سے زیادہ حصہ مزدور یونین کے قائد اور ہندوستان کی تحریک آزادی کے جہد کار کے طور پر گذرا ہے۔ 1940ء کے وسط میں تحریک آزادی میں حصہ لینے کی خاطر ان کی نفع بخش میڈیکل پریکٹس کے قربان سے وہ ذاتی طور پر متاثر تھے۔ نیز ان کی تحریروں اور پرجوش تقریروں سے بھی انہوں نے سب کو اپنا بنالیا تھا۔ ان کی بذلہ سنجی اور شگفتی میں بھی بڑی جان ہوا کرتی تھی۔ مزدوروں کی معاشی بدحالی نے انہیں بے کل کردیا تھا۔ آنجہانی گوڑ صاحب کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے یہ ناگزیر ہے کہ غیر منظّم شعبوں کو منظّم کیا جائے۔ جناب سجاد شاہد نے اپنی تقریر میں گوڑ صاحب سے اپنے نجی تعلقات کا ذکر کیا اور کہا کہ انہوں نے چکڑپلی میں ایک بستی بسائی تھی۔ زندگی کے نشیب وفراز میں ان کی اہلیہ بڑی ہی صبر وشکر کے ساتھ ان کے ہم قدم رہیں۔ برج رانی گوڑ اور راج انکل کی جوڑی بہت خوبصورت تھی۔

انہوں نے مختلف واقعات کی روشنی میں گوڑ صاحب کی سادگی کو ظاہر کیا۔ انہوں نے بتایا کہ فیض احمد فیض پر راج صاحب

کی تحریر فیض فہمی اور فیض کی فلاسفی کی تفہیم میں معاون ثابت ہوسکتی ہے۔ان کی انگریزی اور اردو تحریریں ملک سے باہر بھی شائع ہوتی تھیں۔ان کی خوش انتظامی، خوش تدبیری اور خوش خصالی کی مثالیں ملنا مشکل ہے۔

اودھیش رانی صاحبہ نے گوڑ صاحب کی تحریک سے متعلق بتایا کہ وہ تحریک کو ایک خاندان کی طرح لے کر چلتے تھے۔ اپنے خاندان کیلئے ان کا ایثار بھی مثالی ہے۔ان کی بہن اودھیش رانی نے بتایا کہ گوڑ صاحب کو سامراج کی پالیسیوں سے نفرت تھی۔ افراد خاندان میں ان کی بڑی عزت تھی۔ان کے فیصلے کے آگے سبھی سرخم تسلیم کردیا کرتے تھے۔جھوٹ سے نفرت کی۔ ہمیشہ سچ کہا اور سچ بولنے کی تلقین کی۔ان تمام اوصاف کی بنیاد پر ان کا کردار بہت مضبوط تھا۔انہوں نے ترقی پسند مصنفین کو موجودہ حالات میں ان کے فرائض منصبی سے آگاہ کیا۔

ڈاکٹر علی جاوید نے ٹریڈ یونین مومنٹ سے متعلق بتایا کہ مزدوروں کا استحصال ہورہا ہے۔آج ٹریڈ یونین کمزور ہوتی جارہی ہے۔مینجمنٹ سے ساز باز اس کی ایک اہم وجہ ہے۔گوڑ صاحب ان تمام برائیوں سے بالاتر تھے آج ایک ایسے قائد کی ضرورت محسوس کی جارہی ہے۔فیض، منٹو، سجاد ظہیر کی صدی تقاریب منائی گئیں۔آج گوڑ صاحب کا جشن منایا جارہا ہے۔اس میں مختلف مکتب فکر کے لوگوں کی شرکت سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ گوڑ صاحب عوام وخواص میں کس قدر مقبول تھے۔نئی ٹکنالوجی سے نئی نسل کا انسلاک خوش آئند ہے مگر ان میں اخلاقی انحطاط اور کردار کی زوال پذیری پر غور وفکر کرنے کی ضرورت ہے۔

پروفیسر اشرف رفیع نے اپنی صدارتی تقریر میں کہا کہ حسینی شاہد، زینت ساجدہ، مخدوم، اریب اور گوڑ صاحب حیدرآباد کی ایسی شخصیتیں تھیں جنہیں بھلانا آسان نہیں ہے۔یہ آپس میں ایک خاندان کی طرح رہا کرتے تھے۔ماضی کے لیڈر رہبری اور رہنمائی کرتے تھے، رہزنی نہیں کرتے تھے۔اپنے آپ کو وقف کرنے کا جذبہ ہوتا تھا۔انہوں نے سلسلہ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا کہ راج صاحب اس بات پر قادر تھے کہ اپنی زندگی کو سنوار لیتے، زندگی بنالیتے۔کئی عہدے ان کے لیے چل کر آئے۔عہدوں کے لیے وہ کوئی بھی لالچ نہیں رکھتے تھے۔گوڑ صاحب کئی حیثیتوں سے ایک بڑے اور عظیم انسان تھے۔بے لوث تھے۔مسائل کی یکسوئی کے لیے سنجیدہ تھے۔باریک بین تھے۔لوگوں کی تکالیف پر خود مضطرب ہوجاتے اور اسے دفع کر کے تسکین پاتے تھے۔انہوں نے آج لوگوں میں در آئی تنگ نظری پر حرف رکھا۔انہوں نے کہا کہ آج ہمیں علیگڑھ یونیورسٹی میں ہونے والی دھینگا مشتی نظر نہیں آتی۔ فلسطین کے حالات پر سرسری نظر ڈال کر ہم آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ہمارے اندر تفکر، تدبر کا فقدان ہوا ہے۔انہوں نے گوڑ صاحب سے متعلق بتایا کہ وہ ایک مقصد حیات رکھتے تھے۔شدید مخالفتوں اور نامساعد حالات میں بھی بلند حوصلہ رہے۔ان کی صحبتوں میں رہنے والے بھی ان کا طرز حیات اختیار کر کے آج زندہ ہیں۔قبل ازیں جناب ذکی شاداب حال مقیم امریکہ نے عمدہ نظم پیش کی تھی۔

23 جولائی کو رات آٹھ بجے اُردو ہال میں ممتاز سخنور جناب مضطر مجاز (ماہر اقبالیات) کی صدارت میں ایک محفل شعر منعقد کی گئی تھی جس میں استاد سخن حضرت رحمٰن جامی بحیثیت مہمان خصوصی شریک تھے۔تجمل اظہر نے نظامت فرمائی اور شعراء میں مضطر مجاز، رحمٰن جامی، ڈاکٹر فاروق شکیل، سید سمیع اللہ حسینی سمیع، آغا سروش، محبوب خان اصغر، فرید سحر، مجتبیٰ فہیم، ڈاکٹر طیب پاشاہ قادری، حضرت یوسف روش، تسنیم جوہر، سنیتا للا، تجمل اظہر، انجنی کمار گوئل، جگجیون لال آستھانہ سحر اور ایلزبتھ کورین مونا نے اپنی شعری تخلیقات پیش کیں۔قبل ازیں اودھیش رانی نے ڈاکٹر راج بہادر گوڑ کا کلام پیش کر کے انہیں خراج عقیدت پیش کیا۔تین روزہ تقاریب کے کنوینرز تسنیم جوہر، محسن خان اور فرید ضیائی تھے۔ان تین روزہ تقاریب میں بلاتخصیص مذہب وعمر سامعین کی کثیر تعداد نے شرکت کی۔

☆☆☆

سعیدہ بانو احمد

ڈگر سے ہٹ کر

پیا کا گھر

میں نے شادی کے خلاف جو احتجاج کیا تھا وہ محض جذباتی احتجاج تھا جس میں کوئی وزن نہیں تھا، نہ کوئی مضبوطی اور جان تھی مجھے صرف یہ احساس تھا کہ میں ابھی شادی نہیں کرنا چاہتی۔خصوصاً اس جگہ جہاں کہ طے پائی تھی لیکن ساتھ ہی ساتھ مجھے یہ بھی نہیں معلوم تھا کہ میں واقعی کرنا کیا چاہتی ہوں۔ میرا گھرانا جس ماحول اور معاشرت کا پابند تھا اس میں مجھے خودمختار ہونے یا اپنی روزی کمانے کا خیال پیدا ہوا اس کی گنجائش نہیں تھی یوں ہم لوگ بہت ہی آزاد اور ترقی یافتہ گنے جاتے تھے لیکن یہ آزادی اور ترقی کچھ عجب غیر طے شدہ سی چیز تھی۔ میری بڑی بہن نے ۱۹۱۷ء میں میٹرک پاس کیا تھا۔ اس زمانے میں کسی مسلمان لڑکی کا اتنا پڑھ لکھ جانا بڑی انوکھی بات تھی۔ اس طرح تعلیم کے دروازے عورتوں کے لیے کھل رہے تھے۔ اور میرے لیے تو کالج کا داخلہ ممکن ہو گیا تھا۔لیکن اس کے باوجود ہماری معاشرت کچھ مبہم سی تھی۔ بیرونی حالات ایسے نہ تھے کہ ہم اپنے خیالات پر عمل کرنے کی جرأت بھی کرسکیں۔ زندگی کے ہر پہلو کے اُتار چڑھاؤ کو واضح طور سے سمجھنے کے بعد پرانی اور نئی راہوں میں سے ایک متوازن راہ نکال سکیں۔ اس کی صلاحیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ الجھے ہوئے خیالات اور گھٹے گھٹے احساسات نے ایک مستقل بغاوت اور بے چینی کی شکل اختیار کر لی۔ میرے خط کو نظرانداز کر دیا گیا تھا اور شادی کی تیاریاں شروع کر دی گئی تھیں۔ میرے مزاج کا پارہ ہر وقت چڑھا رہتا تھا، رسموں کے سلسلے میں مجھے مانجھے بٹھایا گیا۔ نائن ابٹن لے کر میرے کمرے میں آتی اور میرے چہرے کا رنگ دیکھ کر صرف میرے ہاتھوں اور پیروں میں ابٹن لگا کر چلی جاتی۔ اس کی یہ مجال نہیں تھی کہ مجھ سے کہتی کہ ''بیٹا ابٹن تو سارے جسم میں لگایا جاتا ہے''۔

۵رفروری ۱۹۳۳ء کو بڑی دھوم دھام سے میری بارات آئی۔ آتش بازی چھوڑی گئی اس پیمانے پر کہ بڑے بڑے آبشار بہہ رہے تھے اور انار آسمان سے باتیں کر رہے تھے۔ طائفہ بھی ساتھ میں تھا اور باہر شامیانے میں مجرا ہو رہا تھا۔ میرا کمرہ پہلی منزل پر تھا۔ جسے میں نے اندر سے بند کر لیا تھا۔ میری بھانجی اور ایک میری دوست مسعود بانو جو بھوپال سے آئی تھیں میرے کمرے میں میرے ساتھ تھیں۔ان کا اصرار تھا کہ میں بارات دیکھوں آتش بازی دیکھوں اور مجرا بھی دیکھوں اور میں تکیے میں سر دیے رو رہی تھی۔

میری ایک بزرگ امریکن دوست مسز Wellons مع اپنی ایک اور امریکن دوست کے دولہن سے ملنا چاہتی ہیں۔ وہ میرے کمرے میں لائی گئیں اور مجھے روتا دیکھ کر بولیں کہ

Come on Saida you should be happy

Have you not met him

میں نے کہا No یہ کہہ کر میں اور زور زور سے رونے لگی۔

وہ دلاسا دینے لگیں۔ ساتھ ہی ضرور حیران ہوں گی کہ یہ مشرقی شادیاں کیسی عجیب ہوتی ہیں۔ یہ ہنگامہ رات بھر رہا۔ صبح مجھے دولہن بنا کر نیچے ڈرائنگ روم میں لایا گیا۔ دولہن کا لباس اس زمانے میں بہت ہی عجیب ہوتا تھا۔ سرخ ریشم یا سوتی گف ململ کا جسے ٹول کہتے ہیں۔ کرتہ پیجامہ اور دوپٹہ اس طرح سلتا تھا کہ اس میں قینچی نہیں لگتی تھیں، شگون یہ تھا کہ دولہا دولہن شیر و شکر بن کے رہیں اور قینچی کی کاٹ سے محفوظ رہیں۔ دولہن کا ایسا گٹھری بنا کے بٹھا دیتے تھے کہ کپڑے کتنے ہی بے ڈھنگے ہوں کوئی اثر نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ میں ڈرائنگ روم میں تخت پر بٹھا دی گئی۔ سامنے دولہا

میاں فروکش تھے۔ ہمارے یہاں دولہا دولہن دونوں کے سہرہ بندھتا ہے ۔دونوں کے اوپر لال شال ڈال دی گئی۔ پھر سہرے اٹھائے گئے ۔درمیان قرآن کا سورہ اخلاص کھول کر رکھ دیا گیا اور ایک بڑا سا آئینہ۔دولہن سے کہا گیا کہ ''بنو بیگم آنکھیں کھولو اور سورہ اخلاص پڑھ کر دولہا کو دیکھو''۔ دولہا میاں سے بھی یہی ارشاد کیا گیا۔مجھ میں سکت نہیں تھی کہ یہ رسم پوری کروں۔دولہا میاں نے دیکھا ہوگا۔ یہ رسم آرسی مصحف کی رسم کہلاتی ہے۔عورتیں فقرے بازیاں کر رہی تھیں کہ بس دیکھ چکو دولہا میاں۔ورنہ لوگ کہیں گے کہ دولہا بڑا بے شرم ہے۔اسی طرح کی چہلیں ہوتی رہیں، پھر یکا یک بابل گایا جانے لگا۔بابل کو دولہن کو رخصت کرنے کے وقت گایا جاتا ہے۔ یہ گیت اس زمانے کی مشرقی شادیوں کے جذبات کی پوری ترجمانی کرتا ہے'' ہرے ہرے بانس کٹاؤ بابل''۔

اندازہ لگایئے کہ لڑکی بالکل نہیں جانتی کہ وہ اپنا میکہ نازوں کا پلا بچپن اور جوانی کو چھوڑ کر کہاں جا رہی ہے، کیسے لوگ ہوں گے، کس قسم کے مرد سے سابقہ پڑے گا۔ یہ گیت سن کر سب آبدیدہ ہو جاتے ہیں۔ میرے والدین نہیں چاہتے تھے کہ اس رقت آمیز سین کو طول دیا جائے۔باہر سے آواز آئی کہ بابل بند کیا جائے۔ دولہن کی رخصتی میں دیر ہو رہی ہے۔ رخصتی کے وقت میرے والد میرے پاس نہیں آئے۔

معلوم نہیں کس نے مجھے گود میں اٹھا کر موٹر میں بیٹھا دیا۔میری جٹھانی بیگم آل رضا میرے پاس بٹھائی گئیں۔شہنائی پر بابل کی دھن زور زور سے بجنے لگی۔

موٹر کے پردے گرا دیئے گئے۔ دولہا میاں ڈرائیور کے ساتھ بیٹھے اور اس طرح میں چلی پیا کے دیس۔

بارات ریڈ ہِل روڈ پہنچی۔گاڑی پورچ میں لگی۔ ہر طرف سے پردہ کیا گیا۔ دولہا موٹر سے باہر آئے۔عقیلہ (میری نند) بھاگ کر موٹر کے پاس آئیں اور بولیں۔میں اٹھاؤں گی اپنی گود میں اپنی دولہن بھابی کو''۔(ساٹھ سال پرانی بات ابھی کل کی بات معلوم ہوتی ہے)

میں بیگم آل رضا سے کہہ چکی تھی کہ ''مجھے دولہا گود میں لے کر نہ اتاریں''۔

بھابھی جان نے عقیلہ کو پہلے ہی خبردار کر دیا تھا۔اسی بنا پر انہوں نے زور سے کہا تھا کہ ''میں اتاروں گی اپنی بھابھی کو گود میں لے کر'' عقیلہ کے اس جملہ نے میرا دل موہ لیا اور میرے ہوش بھی کچھ بجا ہوئے۔کیا اچھے لوگ تھے وہ ادھر عقیلہ نے پھر اعلان کیا۔

''آیئے بھائی صاحب میں آپ کے سر پر اپنا پلہ ڈالوں اور آپ دولہن کے سر پر اپنا ہاتھ رکھئے۔پریم تم دوسری طرح آجاؤ بھائی صاحب کے۔تمہاری ساڑی کا پلہ بھی ان کے سر پر ہونا چاہیئے''۔

پریم شہر کے مشہور سرجن بھاٹیا کی بیٹی تھیں۔اب پریم Beny کے نام سے دلی میں مقیم ہیں۔

میں موٹر سے اتار کر آنگن میں مسند پر بٹھا دی گئی۔پھر یکا یک کسی خاتون نے میرا سہرا اٹھا کر ایک پان میرے منہ میں ٹھونسا یہ کہہ کر تھورا سا کتر لو۔پھر وہی پان دولہا میاں کو کھلایا گیا۔ اس کے بعد چاندی کا تسلہ اور لوٹا ایک خادمہ لے کر کھڑی ہوئی۔ میرے دونوں پیر تام جھام کے ساتھ باہر نکالے گئے اور دولہا میاں کو حکم ہوا کہ دولہن کے پیر دھلاو لوٹے میں دودھ تھا۔پھر دولہا میاں نے رومال سے خشک کیا۔اس رسم کا شگون یہ ہے کہ دولہا دولہن کا تابعدار رہے اور'' دولہن دودھوں نہائے پوتوں پھلے'' یعنی جوڑا خوش وآباد رہے بچوں سے گھر بھرا رہے۔ بھابھی جان مجھے سہارا دیئے میرے پیچھے بیٹھی تھیں اور میرے کان میں کہتی جاتی تھیں کہ آنکھیں مت کھولنا۔بیبیاں منہ دیکھنے آرہی ہیں۔اب یکے بعد دیگرے میرا گھونگھٹ اٹھا کر میرا منہ دیکھا جاتا اور یہ جملے سنائی دیتے کہ ''اے ہے بڑی پیاری شکل ہے دولہن کی''۔''اے بڑا بھولا چہرہ ہے'' ماشاء اللہ وغیرہ وغیرہ۔اس زمانے میں عام طور سے لال تھیلیوں یا خوبصورت لفافوں میں دولہن کی منہ دکھائی یا دولہا کی سلام کرائی کے

نام سے روپیہ دیا جاتا تھا۔ میرے سامنے اس شکل میں لال تھیلیاں یا لفافے جمع ہوتے رہے۔ ایک گھنٹے بعد بھابھی جان نے شور مچایا کہ اب دولہن بہت تھک گئی ہے۔ عقیلہ بی بی کو حکم ہوا کہ دولہن کو ان کے کمرے میں پہنچا دو۔ عقیلہ مجھے گود میں اٹھا کر زینے تک لائیں۔ میرا کمرہ اوپر کی منزل پر تھا۔ میں نے عقیلہ کے کان میں کہا کہ اب گود سے اتار دو۔ زینہ میں خود چڑھ جاؤں گی۔ عقیلہ راضی ہوگئیں اور ہم دونوں تیزی سے سیڑھیاں پار کر کے کمرے میں پہنچ گئے۔ سہرا میں نے اتار کر صوفے پر پھینکا۔ ''ارے ارے یہ آپ نے کیا کیا۔ سہرا تو بھائی صاحب اتاریں گے''۔ عقیلہ گھبرا کر بولیں سہرا پھر سر پر رکھ دیا گیا۔

لو بھلا یہ بھائی صاحب کو تو میں بھول ہی گئی تھی۔ صبح سے اتنا کچھ ہوتا رہا تھا کہ مجھے یاد ہی نہیں رہا کہ ساری ہنگامہ آرائی تو بھائی صاحب کے لیے ہی تھی۔

وہ آ پہنچے۔ عقیلہ چمپت ہوگئیں۔ انہوں نے سہرا اٹھا کر میری گود میں ۵۰۱ روپیہ اور دس اشرفیاں رکھیں اور اپنی طرف کھینچا۔ خدا کا کرنا دیکھئے کہ عین اس وقت آواز آئی کہ ''بھیا دو ئی بج رہے ہیں آپ کا اور دولہن بیگم کا کھانا لگ گوا ہے میز پر۔ بڑی دولہن انتظار کرت ہیں''۔ وہ گھبرا کر مجھ سے الگ ہوگئے۔ میرے حواس بجا ہوئے بھابھی جان کی آواز آئی۔ ''ابن کھانا ٹھنڈا ہورہا ہے'' آرہا ہوں بھابھی جان، یہ کہتے ہوئے انہوں نے مجھ سے کہا کہ ''چلئے کھا لیجئے''۔ میں بلا کسی جھجک کے فوراً تیار ہوگئی۔ دوسرے کمرے میں بھابھی جان موجود تھیں۔ ہم لوگوں نے کھانا کھایا۔ میں بھابھی جان سے باتیں بھی کرتی رہی۔ میں نے نئی دولہن ہونے کا کوئی انداز نہیں اپنایا۔ لیکن کھانا بالآخر ختم ہوگیا اور بھابھی جان کچھ معذرت کر کے چلی گئیں۔ میں پھر اپنے کمرے میں پہنچا دی گئی۔ دن ڈھائی بج رہے تھے۔

ابن صاحب نے اپنے پلنگ پر لیٹتے ہوئے دعوت دی کہ ''آیئے آپ بھی لیٹ جایئے''۔

یا خدا میں کیسے لیٹ جاؤں اس پلنگ پر جو ابن کے پلنگ سے بالکل ملا ہوا ہے۔ میں خاموش اپنی جگہ بیٹھی رہی۔ ابن صاحب نے ہاتھ پکڑ کر کہا کہ آیئے لیٹ جایئے۔

''دیکھئے میں تو آپ کو بالکل نہیں جانتی ہوں۔ پہلے کبھی میں نے آپ کو دیکھا بھی نہیں تھا''۔

مجھے پٹ پٹ بولتے سن کر ابن صاحب نے تعجب سے کہا کہ ''یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ کیا مطلب ہے''۔

''میں چاہتی ہوں کہ ہم اور آپ دو دوستوں کی طرح رہیں، پھر جب ہم میں آپ میں واقفیت ہو جائے تو دیکھا جائے گا۔'' میں نے اپنے ذہن میں یہ ساری گفتگو پہلے سے تیار کر رکھی تھی۔

یہ سٹپٹا کر مجھے دیکھنے لگے پھر بغیر کچھ کہے دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گئے۔ اور تھوڑی دیر میں شاید سو بھی گئے۔ میں پاس ہی ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی۔ ہمت کے ساتھ میں نے اپنے خیالات تو ظاہر کر دیئے لیکن میں اسے ایک بہت بھاری مہم سمجھے ہوئے تھی۔ یہاں ایسا معلوم ہوا کہ یوں ہی ہوتا آیا ہے۔ دولہا میاں سو جاتے ہیں، دولہن ایک اجنبی گھر اور ایک غیر مانوس فضا میں اپنا معاملہ سلجھاتی رہتی ہے۔ اب میں کروں تو کیا کروں۔ چاروں طرف سناٹا تھا۔ صرف ہم دونوں کا کمرہ تھا۔ اوپر کی منزل پر۔ گھر کا ہر فرد چاہتا تھا کہ ہمیں اکیلا چھوڑ دیا جائے۔ چنانچہ اوپر تو کوئی تھا نہیں۔ میں اپنی جگہ گھڑی بنی بیٹھی رہی۔ ادھر اُدھر کوئی کتاب بھی نظر نہیں آئی کہ اس کا سہارا لوں۔ اپنے آپ پر جو اعتماد تھا اس کو سخت دھکا پہنچا تھا۔ بھونچکی سی سوچ رہی تھی کہ اب کروں کیا۔ رات بھر کی جاگی ہوئی تھی، تھکی ہوئی تھی، صوفے پر بیٹھے بیٹھے آنکھ لگ گئی۔ جب جاگی تو دیکھا کہ ابن صاحب کا پلنگ خالی تھا۔ عقیلہ کھڑی کہہ رہی تھیں کہ ''دولہن بھابھی کپڑے بدل لیجئے''۔ نیچے بہت سی رشتہ دار بیبیاں منہ دکھائی کے لیے جمع ہوگئی ہیں۔ میں نے کپڑے بدلے۔ نیچے آئی۔ بہت دیر تک گھونگھٹ اٹھتا رہا اور گرتا رہا۔ میر اثنیں زور زور سے گا رہی تھیں نوجوان دولہنیں اور لڑکیاں مجھ چھیڑ

رہی تھیں، میں چھلیں کر رہی تھیں مگر میں اپنے خیالوں میں غرق تھی۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ میں نے ایک انوکھی راہ تو نکالی تھی لیکن میں ٹیڑھی فطرت کی لڑکی نہیں تھی۔ روٹھنا، بگڑنا، منہ لپیٹ کر لیٹ جانا؟ یہ ڈھنگ میری تربیت میں شامل ہی نہیں تھے۔

میرے والد بہت روشن خیال تھے اور انہوں نے مجھے Isabella مسلم کالج تک پہنچنے کا موقع دیا تھا۔ جہاں کی آزاد اور صحت مند فضا میں مجھ میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہوئی اور خو کو نظم اور ضبط کا پابند بنا سکی۔ ساتھ ہی ساتھ ایک مبہم سی خلش بھی سر اٹھانے لگی کہ عورتوں کے ساتھ بڑی ناانصافی ہوتی ہے۔ آخر وہ بھی انسان ہیں۔ انہیں بھیڑ بکری کیوں سمجھا جائے۔ انہی جذبات کے تحت مجھ میں یہ جرأت پیدا ہوئی تھی کہ میں اپنے شوہر سے اس طرح بلا جھجک گفتگو کر سکی۔ لیکن ان کا جو ردِّ عمل ہوا وہ میری سمجھ سے باہر تھا۔

رشتہ داروں اور مہمانوں سے گھری میں رات تک ساکت و صامت بیٹھی رہی۔ جس کا جی چاہتا گھونگھٹ اٹھاتا میری ٹھڈی اونچی کرتا، دعائیں دیتا، تعریفیں کرتا، ہٹ جاتا۔ اب کھانے کا وقت آ گیا۔ میں پھر اوپر لے جائی گئی۔ کھانا میز پر لگا ہوا تھا بھابھی جان بھی موجود تھیں اور ابن صاحب بھی۔ خاصی خوشگوار فضا میں کھانا ختم ہوا۔ دولہا میاں نے کہا کہ آیئے اوپر کھلی چھت پر سے بے نظیر کا گانا سنئے۔ بے نظیر شہر کی مشہور طوائف تھی۔ بھابھی جان نے سن لیا کہنے لگیں کہ یہ غضب نہ کرنا۔ وہاں پہلے ہی سے پچاسوں بیبیاں پر اجمائے بیٹھی ہیں گانا سننے کے لیے۔ دولہن کو دیکھ کر چہ می گوئیاں کریں گی اور تم کو دیکھ کر کہیں گی کہ ''اے یہ مردوا کہاں چلا آ رہا ہے''۔ ساری بیبیاں تو پردا کرتی ہیں، لو صاحب ہم دونوں پھر اپنے کمرے میں واپس آ گئے۔ میں کریب کا چاند تارے لگا ہوا دوپٹہ اوڑھے تھی، ابن احب نے میرے قریب بیٹھتے ہوئے کہا کہ آپ کا دوپٹہ بہت خوب صورت ہے کیسے بنا''۔

''سوئی سے'' میں نے جواب دیا۔

میرا جواب گو مختصر مگر خاصا شوخ تھا۔ ان کو میرا یہ جواب ناگوار گزرا۔ انہوں نے خاموشی سے اپنی شیروانی اتاری اور میری طرف پیٹھ کر کے لیٹ گئے اور مجھے نہیں معلوم کہ سو گئے یا جاگتے رہے۔ میں البتہ حیران ملزم سی بنی بہت دیر تک بیٹھی رہی۔ انہوں نے کروٹ تک نہیں بدلی۔ اب دھیرے دھیرے میری سمجھ میں آیا کہ ''بی دولہن بیگم عقل کے ناخن لو تمہاری ناز برداری نہیں کی جائے گی۔ اٹھو کپڑے بدلو یا نہ بدلو پاس والے پلنگ پر تمہارا بستر لگا ہوا ہے سو جاؤ یا نہ سوؤ۔ جہاں بیٹھی ہو وہیں بیٹھی رہو''۔ میں پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی ایک آدھ سسکیوں کی آواز بھی نکل گئی۔ مگر وہ بندہ خدا سوتے ہی رہے۔ رو دھو کر میں اٹھی کپڑے بدلے اور پھر آہستہ سے اسی صوفے پر لیٹ گئی۔ فروری کی ابتدا، سردی کا موسم کسی وقت میری آنکھ لگ گئی۔ صبح جب آنکھ کھلی تو ابن صاحب مردانے میں جا چکے تھے۔ عقیلہ بی بی میری نند اور ان کی کچھ سہیلیاں میرے پاس کھڑی تھیں۔ انہوں نے بڑی محبت سے میری صبح کی ضروریات پوری کروائیں۔ پھر ناشتہ وغیرہ منگوایا۔ ابن صاحب اور بھابھی جاں ناشتے پر میرے ساتھ تھے۔ پھر مجھے نیچے لے جایا گیا۔ وہاں وہی کل کا سا عالم تھا۔ میراثنیں سہرے بنرے'' گا رہی تھیں۔ مہمانوں کی چہل پہل، لڑکیوں کے قہقہے، آپس کی چھیڑ چھاڑ سب کچھ جاری تھا۔ مگر آج میرا گھونگھٹ اتنا لمبا نہیں تھا۔ مجھے قاعدے سے دوپٹہ اوڑھا کر بٹھا دیا گیا تھا، آج ولیمہ کی دعوت تھی۔ میں ڈرائنگ روم میں بٹھائی گئی۔ مہمانوں کا سلسلہ شروع ہوا۔ آج اکثر بیبیوں نے دوپٹہ ہٹا کر میرا زیور بھی دیکھا اور یہ بھی پوچھ گچھ ہوئی کہ فلاں زیور کہاں کا ہے۔ میکے سے ملا ہے یا سسرال سے وغیرہ وغیرہ۔ رسم یہ ہے کہ دوسرے دن دولہن اپنے گھر جاتی ہے۔ اس کے بھائی لینے آتے ہیں، دولہن کے ساتھ ان کے دولہا میاں بھی دولہن کے میکے جاتے ہیں۔ پھل میوہ ساتھ لے کر۔ پھر وہاں چوتھی کھیلی جاتی ہے۔ چوتھی کی رسم بہت دلچسپ ہوتی ہے۔ دولہا کے ساتھ ان کی بہنیں بھائی اور سہیلیاں بھی دولہن کے میکے آتی ہیں۔

تخت پر یا فرش پر ایک طرف دولہا اور ان کے سامنے دولہن ہوتی ہے۔ دولہا کے ساتھ ان کی بہنیں بھائی اور دوسرے ساتھی براجمان ہوتے ہیں۔ اور دولہن کی طرف ان کے رشتے دار اور طرف دار۔ پھر پھلوں پھولوں اور ترکاریوں سے ایک طرح کی ہولی کھیلی جاتی ہے۔ ایک دوسرے پر خوب خوب حملے ہوتے ہیں۔ تھوڑی دیر خوب ہلڑ باڑی رہتی ہے۔ مقصد اس رسم کا یہ ہے کہ دونوں خاندان کے لوگ اور دولہا دولہن ایک دوسرے سے بے تکلف ہو جائیں اور اجنبیت کم ہو۔ چنانچہ لڑکے لڑکیوں نے خوب اودھم مچایا اور جب تھک کر چور ہو گئے تو یہ تماشا ختم ہوا۔ شادی کے سلسلے کی یہ آخری رسم ہوتی ہے۔ ہفتوں سے یہ ہنگامہ آرائی چل رہی تھی۔ مہمان میزبان سب ہی تھکے ہوئے تھے۔ اس لیے رات کا کھانا بھی جلدی ہی ہو گیا۔ میرے سسرال والے رخصت ہوئے اور میں اپنے کمرے میں پہنچا دی گئی اور تھوڑی دیر میں ابن صاحب بھی آ گئے۔ وہ دو تین دن میرے یہاں رہنے کے لیے آئے تھے۔

میری تربیت میں جو تھوڑی سی روشنی پہنچا دی گئی تھی وہ میری مصیبت بن گئی۔

''اے روشنی طبع تو برمن بلا شدی'' کا مضمون تھا۔ خصوصاً یہ خیال جم گیا تھا کہ دو انجانے انسانوں کو شادی کے بندھن میں جکڑنا بڑی ناانصافی ہے۔ اس کے ساتھ مجھ میں قوت عمل بالکل نہیں تھی۔ یہ ایک الھڑ، ناپختہ کار خوابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی کے خیالات تھے۔

اب ہم دونوں پھر تنہا تھے۔ مجھ پر کل کی سی حالت کے ساتھ ساتھ ایک غیر یقینی کیفیت بھی طاری تھی۔ ساری جولانی ختم ہو چکی تھی۔ بہر حال اٹھی ڈریسنگ روم میں جا کر کپڑے بدلے، روئی تھوری دیر، پھر دبے پاوں آ کر اپنے پلنگ پر لیٹ گئی۔ میری انوکھی راہ محض ناسمجھی اور خام خیالی تھی، شادی میری ہو چکی ہے یہی میری دنیا ہے چاہے میں اس میں پھول چنوں یا خاک اڑاؤں۔ یہ میں پہلے کہہ چکی ہوں کہ میری فطرت میں کوئی چھل کپٹ بغض وعناد نہیں تھا، نہ ان سے میں نے کوئی دشمنی باندھی تھی۔ میں مرد کی فطرت سے بالکل واقف نہیں تھی۔ اور اب میں جس کیفیت سے گزر رہی تھی وہ ایسی تھی کہ میں اپنی ساری شوخی و شرارت بھول چکی تھی۔ دن بھر رشتہ دار لڑکیاں اور نوجوان دولہنیں مجھے طرح طرح سے چھیڑتیں اور میں خوش خوش نظر آنے کی کوشش کرتی رہتی۔ مجھے روز نئے نئے جوڑے پہنائے جاتے اور سولہ سنگار کر کے رشتہ داروں میں بٹھا دیا جاتا۔ میرا یہ حال تھا کہ ہر وقت رونے کو جی چاہتا رہتا۔ لیکن میری تربیت یہ ہوئی تھی کہ جب رونا آئے تو مسکرانا سیکھو۔ وہی کر رہی تھی۔ لیکن اب میرا اعتماد رفو چکر ہو چکا تھا۔ میری سانس نندیں اور گھر کی ساری لڑکیاں میری خاطر مدارات میں بچھی جا رہی تھیں۔ عقیلہ اور بیگم رضا اس قدر شفقت سے پیش آ رہی تھیں کہ میری اجنبیت قریب قریب بالکل ختم ہو گئی تھی۔ میں مرد کی نفسیاتی فطرت اور اس کے لیے ازدواجی ناطے کی اہمیت سے بالکل ناواقف تھی۔ آج میں سوچتی ہوں تو سمجھ میں آتا ہے کہ ابن صاحب کے لیے میرا رویہ کس درجہ ناقابل قبول تھا، وہ کس قدر روح فرسا کیفیت سے گزر رہے ہوں گے۔ والدین کی طے کی ہوئی شادی کی بنیاد اور ساری خوشیاں جنسی ناطے کی آسودگی پر مبنی ہوتی ہیں۔ باہری رسم و رواج کے قیود اور پابندیاں ایسی ہوتی تھیں کہ ایک طویل عرصے تک دولہا دولہن صرف رات کو ملتے تھے اور شادی کی بنیاد صرف ازدواجی رشتے پر مبنی ہوتی تھی۔ دن کا وقت رشتہ داروں اور دولہن پر عائد مختلف ذمہ داریوں میں گزرتا تھا۔ یہ ضرورت بالکل نظر انداز کر دی گئی تھی کہ دولہا دولہن ایک دوسرے کے مزاج کو سمجھیں اور اپنے آپ کو زندگی بھر کی رفاقت کا اہل بنائیں۔ وقت گزرنے کے ساتھ جب یہ سماجی بندھن ڈھیلے پڑنے لگتے تو میاں بیوی کے درمیان نااتفاقیاں سر اٹھاتیں اور زندگی کی ہم آہنگی کو بنائے رکھنا مشکل ہو جاتا۔ میں سب کے سامنے مجھ سے اچھی طرح پیش آتے۔ رات کو قدرے مکدر ہو کر کروٹ لے کے سو جاتے۔ میں جاگتی رہتی اور کڑھتی رہتی پھر ایک دن نامعلوم ڈھنگ سے ہماری اجنبیت دور ہو گئی۔

اب ابن صاحب بہت خوش نظر آتے۔ اور یہ معمول بن گیا کہ صبح کے ناشتے سے فارغ ہو کر ابن سارے دن زنانے مکان میں رشتے دار لڑکیوں، امی، بی، ارتضیٰ، اختری، کلثوم وغیرہ وغیرہ سے گھرے بیٹھے رہتے اور قصے کا شغل جاری رہتا۔

مجھے یہ عجیب معلوم ہوتا تھا کہ مرد زنان خانے میں سارا دن کیسے گزار سکتے ہیں۔ بہر حال میرے لیے تو بہت سی باتیں نئی تھیں۔ مگر سب سے زیادہ مشکل مسئلہ یہ تھا کہ ہمارے تعلقات میں کبھی کبھی انتہائی قربت اور محبت کے بعد یکا یک کچھ ایسا ہو جاتا کہ محبت کے سارے قلعے ڈھے جاتے اور ایسا محسوس ہوتا کہ آسمان سے اٹھا کر تحت الثریٰ میں پھینک دی گئی ہوں۔ یہ ایک دم میری طرف سے پیٹھ کر لیتے اور میں کھوئی کھوئی سی لیٹی رہتی۔ ان کی بے نیازی میں فرق نہ آتا تو میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتی۔ میرے نویلے دولہا نے مجھے کبھی منانے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ وہ تو پہلے ہی میری کسی نادانستہ بات پر مجھ سے روٹھ چکے تھے۔ میں نے آج تک نئی دولہنوں سے جو ماجرے سنے تھے وہ تو یہ تھے کہ دولہن نازنخرے کرتی رہتی ہے اور دولہا کی مناتے گزرتی ہے۔ خوشامدیں ہوتیں، دلداریاں کی جاتیں دولہنیں ان کا ذکر کرتیں تو ان کے چہرے دمک اٹھتے۔

یہاں اس کے بالکل برعکس ہو رہا تھا۔ مختصر دو نہایت کم عقل ہستیاں یک جا کر دی گئی تھیں۔ میں نے شادی کی رات کو ان کے ارمانوں اور امنگوں پر جو پانی پھیرا تھا اس کا خمیازہ تو مجھے بھگتنا ہی تھا اگر یہ ہنستے میرا مذاق اڑاتے یا برسر پیکار ہی ہو جاتے۔ مگر انہوں نے پوری صورت حال کو Cold War کی شکل دے دی اور میں ان کی نفسیاتی کیفیت کو نہ سمجھ سکی۔ میں نے بظاہر کبھی کسی سرکشی کا اظہار نہیں کیا۔ مگر میں ایک کھلنڈری سی لڑکی تھی۔ شادی میں سر جھکا کے دولہن تو بن گئی مگر شرمائی لجائی دولہن تو نہ بن سکی۔ کام کے حربوں سے بالکل مسلح نہ تھی۔ اور یہاں عباس رضا ایسے سادہ دل، نیک طبیعت و نیک نفس انسان کو ضرورت تھی کہ ایسی عورت کی جو اول دن سے شوہر کی شخصیت میں ضم ہو جاتی اور ہر ہر طرح ان کے جذبہ خودی کو تقویت پہنچاتی۔ اور بقول میری ایک جٹھانی کے جو اپنے شوہر سے کہتی رہتی تھیں کہ ''جو تم کا اچھا لگت ہے او ہم کا اچھا لگت ہے''۔ یہ جملہ ورد زبان رکھتیں۔ یہ میں نہ کر سکی۔ دھیرے دھیرے گھر والوں سے میری اجنبیت دور ہوتی جا رہی تھی۔ ابن صاحب اب بھی خود بخود روٹھ جاتے تھے اور پھر مان بھی جاتے تھے۔ ہمارے درمیان اتنا تکلف تھا کہ مجھے پوچھنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ آخر کیا ہوا آپ کیوں خفا ہیں!

شروع کے چند ماہ اس تکلف میں ہی گزرے۔ یہ ضرور ہوتا تھا کہ جب یہ خفا خفا رہتے تھے تو مجھے کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا تھا، نہ کھانا کھاتے بنتا تھا نہ کہیں آنا جانا۔

میں حتی الامکان سب کو بالکل نارمل نظر آتی اور روز کے کام اور دستور کو نبھاتی رہتی۔ ممکن ہے کہ میرے اس ڈھنگ سے ابن سمجھتے ہوں کہ مجھ پر ان کی ذہنی کیفیت کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ مگر ایسا تھا نہیں۔ میں ابن کے خفا خفا رہنے پر ہر وقت کڑھتی رہتی تھی اور تنہائی میں اکثر روتے کٹتی تھی۔ اب البتہ میں یہ سوچتی ہوں کہ اگر میں اس وقت خوب ڈھونگ رچاتی۔ منہ لپیٹ کر پڑ جاتی جیسے ابن کرتے تھے، آپس کی ناچاقی کا چرچا کرتی اور ایک تماشا کھڑا کرتی تو کیا ہوتا۔ بہر حال اب یہ سوچنے سے کیا حاصل۔ اس وقت تو زندگی ایک معمہ بنتی چلی جا رہی تھی۔ میں تریا چرتر سے واقف نہیں تھی۔ یہ صفت ازدواجی زندگی میں خاصی کام آتی ہے۔

☆☆☆

سب رس

میں صرف **غیر مطبوعہ** مضامین اور تخلیقات شائع ہوتے ہیں۔

راجکماری اندرا دیوی دھن راج گیر/اشرف رفیع

یادیں

حیدرآباد فرخندہ بنیاد اپنی تاریخ تہذیب، اپنی محبت مروت خلوص کے لیے مشہور رہا ہے۔ جہاں اس کی تاریخ اور تہذیب کی تعمیر یں امراء عمائدین جنگ دولہ وغیرہ کا اہم حصہ رہا ہے وہیں عوام نے اس دولت کو آج بھی سنبھالے رکھا ہے۔ اس حیدرآباد دکن کا ایک خاندان جس کی اپنی جگہ بڑی اہمیت ہے وہ ہے نواب فخر الملک بہادر کا خاندان۔ اس خاندان کے پر پوتے میر اصغرحسین سے ایک تفصیلی مگر غیر رسمی گفتگو کا موقع ملا اس گفتگو کا اقتباس یہاں پیش ہے۔ جس سے فکر ونظر کو چونکا دینے والی کئی باتیں سامنے آتی ہیں۔ اصغرحسین نواب میر معظم حسین اور مہر النساء بیگم کے صاحبزادے آغا حیدرحسن کے نواسے ہیں نہایت مہذب، اعلیٰ تعلیم یافتہ، خوش اخلاق، خوش مزاج، فنون لطیفہ کے شیدائے ادب کے پروروہ اردو ادب کے گرویدہ ہیں۔

ہندوستان سے انگریز جانے والے تھے۔ دوسری جنگ عظیم ختم ہو چکی تھی زمانہ بدل رہا تھا ہواؤں کے رُخ بدل رہے تھے سکندرآباد کے ملٹری ہاسپٹل میں 24/نومبر 1946ء کو ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ زمانہ بڑے حشر کا زمانہ تھا۔ اس دواخانے میں عموماً سیول سرویز کی فیملی کے بچے پیدا ہوتے تھے۔ اس زمانے میں آج کی طرح Birthdays نہیں منائے جاتے تھے لیکن آغا صاحب کے گھرانے میں یہ رواج تھا۔ میر اصغرحسین کی تاریخ پیدائش میں اختلاف تھا کوئی کہتا تھا 27/نومبر اور کوئی 24/نومبر اس لیے ان کو دو دو سالگریں ہوتی تھیں ایک 24/نومبر کو ایک 27/نومبر کو جب انہیں برتھ سرٹیفیکٹ کی ضرورت ہوئی تو سکندرآباد ملٹری ہاسپٹل سے ریکارڈ غائب ہو چکا تھا۔ 1980ء میں پروفیسر نونیت راؤ سابق وائس چانسلر عثمانیہ یونیورسٹی نے برتھ سرٹیفکٹ نکلوا کر دیا جس میں 24/ نومبر 1946ء تاریخ پیدائش درج ہے۔ والد (میر معظم حسین) Ministry of Revenue of Interior میں برٹش آفیسر کے پرنسپل اسٹیٹ تھے۔ میر اصغرحسین کی پیدائش کے فوری بعد میر معظم حسین کو اوٹی جانا پڑا۔ ان کے والد صاحب کی انگریزی کے انگریز بھی مداح تھے۔ ان کا قیام گرین لینڈ لارڈ ولنگڈن کے آفس ہی میں تھا۔ لیڈی ولنگڈن، میر معظم حسین سے بہت قریب تھیں۔ وہ بڑی گڑبڑ کا زمانہ تھا۔ انگریزوں کو بہت ستایا جا رہا تھا۔ جس کے باعث لیڈی ولنگڈن کا نروس بریک ڈاؤن ہو گیا تھا۔ میر معظم حسین میاں بیوی دونوں کو بہت سکون دیتے تھے۔ حیدرآباد سے اکثر زمینات کے کورٹ لارڈ ولنگڈن کے پاس آتے تھے۔ میر معظم حسین میاں بیوی دونوں کو بہت سکون دیتے تھے۔ حیدرآباد سے اکثر زمینات کے کورٹ لارڈ ولنگڈن کے پاس آتے تھے۔ میر معظم حسین صاحب ان میں سے اکثر کو جانتے۔ پہچانتے تھے۔ میر معظم حسین صاحب انہیں Respect دیتے تھے۔ آنے والے چاہتے تھے کہ ویلفیر یڈ گریکسن بھی انہیں وہی عزت دے مگر یہ ناممکن تھا برٹش کوڈ تھا کہ انگریز مقامی لوگوں سے دور ہی رہیں اس سلسلے میں معظم حسین آنے والے لوگوں کی حتی الامکان مدد کرتے تھے۔ دوسرے منسٹر بعض وقت پریسیڈنٹ آف ایکزیکیٹیو کونسل سے ملنے آتے تھے اوپر سے لارڈ ولنگڈن دیکھ لیتے اور کہا کرتے تھے ''ان سے بولو ہم نہیں ہیں''۔ میر معظم حسین صاحب مرحوم کے لیے یہ لمحہ بڑا سخت ہوتا تھا۔ غلط بولا نہیں جا سکتا ویسے بھی آنے والے ولنگڈن کو اوپر موجود دیکھ لیتے تھے۔ اصغرحسین کی والدہ صاحبہ (مہر النساء بیگم) وہاں روز جاتے تھے۔ نواب اکبرنواز جنگ کے محل سے قریب مکان تھا۔ بعد میں میر معظم حسین ڈانگ گجرات کے وزیر تھے۔ بنانے کے لیے

ویلفیر ڈگریکسن سے بھی معظم حسین صاحب کی کافی ملاقتیں رہیں۔ جب یہ گجرات کے وزیر بنائے گئے تو لوگوں نے سخت مخالفت کی ویلفیر ڈگریکسن نے ان کی پُر زور تائید کی اور کہا کہ وہ اسی کام کے لائق ہیں۔ میر معظم حسین صاحب اس عہدہ کا جائزہ لینے سے قبل اجازت کے لیے پہلے اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اجازت مانگی۔ اعلیٰ حضرت نواب میر عثمان علی خاں کرتا پاجامہ اور ٹوپی پہنے کرسی پر بیٹھے تھے۔ وہ سیدھا پاؤں ہمیشہ ہلاتے رہتے تھے دبلے پتلے تھے مگر آواز میں گھن گرج تھی سمجھئے کھرج میں بات کرتے تھے۔ ''فرمایا کیوں؟ تم کو یہاں کچھ نہیں ملتا؟ تم کو انگریزوں کے پیچھے جانے کی کیا ضرورت ہے؟ کیوں جا رہے ہو تمہیں دو دفعہ تمغہ آصفیہ ملا جو تمہاری قابلیت کی وجہ سے ملا اور اب وہ کام کون کرے گا جو تم کرتے ہو۔ کیوں یہ سب چھوڑ کے جا رہے ہو'' میر معظم حسین نے نذر پیش کی۔ کہا ''میں اور میرا خاندان آپ کی نمک فراموشی نہیں کر سکتا۔ جو کچھ مجھے ملا ہے حضور کی سیول سرویز کی وجہ سے ملا ہے۔ میں صرف چند مہینوں کے لیے جاؤں گا پھر واپس آجاؤں گا''۔ انہوں نے کچھ اس طرح عرضی گزاری کہ شاہ وقت کو منظوری دینی ہی پڑی فرمایا ''اچھا اچھا اچھا۔ یہ اعلیٰ حضرت کی عادت تھی وہ ایک بات کو کئی مرتبہ دہراتے تھے میر اصغر حسین نے یہ واقعات سناتے ہوئے کہا ''والد صاحب ہمیشہ کہتے تھے اعلیٰ حضرت کے ساتھ دس منٹ بیٹھنا جیسا شیروں کے درمیان رہنا تھا میں شیروں کے ساتھ بیٹھ سکتا تھا مگر ان کے رعب کو برداشت کرنا مشکل تھا، اصغر صاحب نے فرمایا اعلیٰ حضرت کی آنکھوں میں عجیب چمک تھی عجیب رعب تھا کوئی ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر ایک سکنڈ نہیں دیکھ سکتا تھا اس کیفیت کو ایک Spanish آرٹسٹ آزیبل کی پینٹنگس میں دیکھ سکتا ہے''۔

میر معظم حسین گجرات چلے گئے اصغر کی والدہ کو اس کا رنج تھا تکلیف تھی چند مہینے اپنے شوہر سے دور رہنے کی لیکن انہیں اس کی عادت سی ہو گئی تھی اکثر معظم حسین دور ہی رہتے تھے۔ جنگلوں میں پھرتے تھے گونڈوں کے درمیان رہتے تھے۔ بنڈیوں میں آنا جانا رہتا تھا بنڈیاں بھی کیسی جن میں قالین بچھا رہتا گاؤ تکئے لگے رہتے تھے۔ جب بھی وقت ملتا وہ حیدرآباد آجاتے۔ 1944ء سے 56 تک یہی حال رہا۔ یہ اصغر صاحب والدہ یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتی تھیں کہ گھر چلئے گا تو یہ بھی وہیں چلی جائیں گی۔ والد کے غیاب میں یہ زمانہ اصغر حسین وغیرہ نے اپنے نانا کے ساتھ (آغا حیدر حسن) حیدر منزل، بنجارہ ہلز میں گزارا۔

اوٹی میں حیدرآباد کے اکثر امیروں، نوابوں کے بنگلے تھے۔ نواب سالار جنگ کا بنگلہ اوڈ کوک فورٹ تھا۔ وہ معظم حسین کے ماموں تھے۔ معظم حسین صاحب سیول سرویس میں تھے مگر انہوں نے کبھی اپنی خاندانی وجاہت اور رشتوں کا ذکر نہیں کیا۔ وہ جو کچھ تھے اپنی قابلت کی وجہ سے تھے۔ اوٹی میں میر معظم حسین کا جو وقت گزارا وہ نہایت سوشیل رہا وہ جس ماحول میں تھے وہ یوروپین ماحول تھا۔ آفیشیل پارٹیز، ڈانس پارٹیز، بنکویٹ وغیرہ معظم حسین کو اس کے لیے بھی تیار رہنا پڑتا تھا۔

ایک رات اوٹی میں بڑی غضب کی رات گزری میر اصغر حسین بہت چھوٹے تھے بہت تیز بخار سے بدن تپ رہا تھا رنگ بالکل پیلا پڑ گیا تھا ڈائریا ہو گیا تھا۔ والدہ مہر النسا نے اپنے شوہر معظم حسین سے کہا کہ ڈاکٹر کو بلوائیے میرے بیٹے کو دیکھنے کے لیے'' انہوں نے ڈاکٹر کو فون کیا رات کے 12، ایک بج رہے تھے۔ ڈاکٹر نے فون اٹھایا کیفیت سن کر کہا صبح کلینک کے وقت لائیے ہمارے یہاں وقت کی پابندی ہوتی ہے۔ اصغر صاحب کی والدہ آخر معظم حسین کی بیوی تھیں وہ کسی کی نہیں'' نہ سنتی تھیں۔ والدہ نے ضد کی اور اپنے شوہر اور بچے کو لے کر ڈاکٹر کے گھر پہنچ گئیں۔ ڈاکٹر نے کہا ''میں بولا صبح میں لانے کو یہ کوئی وقت ہے'' مہر النسا نے ڈاکٹر سے کہا ذرا میرے بچے کی صورت تو دیکھ لیجئے۔ میں صبح اسے

پھر لاؤں گی، سرخ وسفید گول مول چہرے کے ڈاکٹر نے بالجر بچے پر ایک نظر ڈالی۔ تشویش ناک لہجے میں کہا پہلے کیوں نہیں لائے میں نہیں کہہ سکتا صبح تک یہ بچہ زندہ رہے گا یا نہیں ایک لمحے کے بعد کہا اسے میرے پاس چھوڑ جایئے۔ والدہ (مہر النساء) رونے لگیں۔ ڈاکٹر جو بہت سخت تھا اس نے دلاسہ دیتے ہوئے کہا

Look! here my dear, nothing is impossible and I will personally sit with the baby, you cant get some rest, and come in the morning, if there anything in the night I will let you know.

مہر النساء ڈاکٹر کے اس انسانیت ہمدردی اور غیر معمولی توجہ سے بہت متاثر ہوئیں وہ اپنے بچوں سے کہا کرتی تھیں کہ کسی کے first impression پر بھروسہ اور یقین نہ کریں اندر سے انسان کچھ اور ہوتا ہے وہ رات بوجھل قدموں سے واپس ہوئیں۔ ڈاکٹر وہاں رات بھر بیٹھا رہا خود بچے کو برف سے مساج کرتا پھر مالش کرتا پھر برف سے مساج کرتا رہا۔ بڑی مشکل سے ماں باپ کی رات گزری صبح کا انتظار مشکل تھا صبح کلنک کے ٹائم پر پہنچے۔ دیکھا ڈاکٹر کی آنکھیں لال تھیں صاف پتہ چل رہا تا رات بھر ڈاکٹر سویا نہیں۔ معظم حسین نے ڈاکٹر سے دریافت کیا کہ بچے کی کیفیت میں کچھ فرق ہوا کہ نہیں ڈاکٹر نے کہا رات سے تو بہتر ہے لیکن میں کچھ کہہ نہیں سکتا ابھی بچے کو نہیں لے جا سکتے وزیٹنگ اورز میں آ کر دیکھ جایئے اسے مجھ پر چھوڑ دیجئے جو کچھ میں کر سکتا ہوں کروں گا''۔ چند دن ڈاکٹر نے بچے کو اپنے ساتھ رکھا جب سنبھل گیا تو لے جانے کی اجازت دی بچہ کی ماں نے ڈاکٹر کا شکریہ ادا کیا اور فیس کے بارے میں پوچھا تو ڈاکٹر نے جواب دیا'' کچھ نہیں، وہ تو میرا فرض تھا بچہ کی حالت ایسی تھی میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ مہر النساء بیگم بہت متاثر ہوئیں بیگم مہر النساء اپنے والد کی طرف سے مغلیہ سلطنت کی تباہی کا حال سن چکی تھیں انگریزوں کے ظلم وستم کی داستان آنکھوں دیکھے واقعات، سن رکھے تھے ان کے خاندان کے اٹھارہ لوگ آزادی کی تحریک میں انگریزوں کے ہاتھوں شہید ہو چکے تھے۔ وہ تو یہ سمجھتی تھیں کہ یہ خونخوار ظالم لوگ ہیں مگر جب ڈاکٹر کے اس رویہ کو دیکھا تو کہنا پڑا ان میں بھی انسانیت اور ہمدردی ہوتی ہے۔ وہ یہ بھی سن چکی تھیں تحریک آزادی کے زمانے میں ان کے خاندان کی خواتین قبرستانوں میں بے یارو مددگار جسم پر شہید قسم کی کوئی چیز لگا کر مریضوں کی طرح بیٹھی رہتی تھیں خاکی یہ سمجھتے تھے کہ یہ تو خطرناک بیماری میں مبتلا عورتیں ہیں۔ کچھ نہ بس چلا تو عورتیں باولیوں میں کود کر جان دیتی رہیں۔ اعلیٰ حضرت بھی انگریزوں سے خوش نہیں تھے۔

بیگم مہر النساء کی والدہ گوالیار میں تھیں ان کا پورا خاندان اس وقت آزادی کی تحریک میں تھا۔ ان کے ماموں زاد بھائی سبھاش چندر بوس کے ساتھ، بوس کی فوج میں تھے۔ سبھاش چندر بوس پکڑے گئے بدر النساء کے ماموں زاد بھائی بچ گئے۔ اس لیے مہر النساء کا خاندان انگریزوں سے دور ہی رہا۔

میر اصغر حسین کے والد میر معظم حسین ارم منزل میں پیدا ہوئے۔ 9، 10 سال کی عمر میں ارم نما آ گئے (جہاں اب ٹی بی ہاسپٹل ہے (اس زمانے میں نوابوں، جاگیرداروں میں تفاخر اور تقابل کا گہرا جذبہ ہوا کرتا تھا۔ نواب فخر الملک میر اصغر حسین کے پر دادا تھے۔ نواب صاحب اور وقار الامراء میں ہمیشہ ٹکر رہتی تھی محل تو محل اس کا بھی مقابلہ ہوتا تھا کہ کس کا ڈائننگ ٹیبل بڑا ہے۔ فلک نما کا ڈائننگ ٹیبل 101 آدمیوں کے لیے بنا تھا فخر الملک کو یہ خیال ستا تا رہا۔ اس زمانے میں امراء شہر اور آبادی سے دور رہتے تھے۔ فخر الملک شہر کی گھڑیال کی دیوڑھی ارم منزل کو چھوڑ کر اسد باغ آ گئے (موجودہ نظام کالج) تھے۔ اعلیٰ حضرت کی خواتین نے شکایت کی فخر الملک کی خواتین اپنی دیوڑھی کی چاندنی سے فتح میدان پر پریڈ دیکھتی ہیں اور ہم اس لطف سے محروم ہیں۔ سرکار کی

نظر اسد باغ پر پڑ گئی۔فخر الملک نے اسد باغ سرکار کے نذر کر دیا جس کا تھوڑا سا معاوضہ سرکار کی طرف سے بعد میں عطا ہوا۔سرکار ارم منزل بھی جا چکے تھے۔جہاں میر معظم حسین پیدا ہوئے تھے۔فخر الملک اسد باغ چھوڑ چکے تھے دیکھا ارم منزل کی طرف آبادی بڑ رہی ہے تو ارم نما(ایرہ گڈہ) آگئے ارم نما رہائش سے زیادہ Hunting Lodge کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔انھوں نے یہاں بڑا اور بہت ہی خوب صوت ڈائننگ روم بنایا انہیں یاد تھا وقار الامراء سے ٹکر تھی تو یہ ڈائننگ روم اسپیشل روم کی طرح تعمیر ہوا جس کا میز 121 افراد کے لیے تھا۔ارم نما میں بیگم فخر الملک کا انتقال ہوا۔ اس کے قریب ہی ان کا مقبرہ تعمیر ہوا خود فخر الملک اس کی تعمیر دیکھنے کے لیے روز جاتے تھے۔

فخر الملک کے انتقال 1934ء کے بعد کونسل کے مہمانوں کے لیے ارم اور اس کا ڈائننگ روم استعمال ہونے لگا۔ خاندان فخر الملک سے اجازت تھی۔خصوصاً انگریزوں کی جو دعوت حیدرآباد اسٹیٹ کی طرف سے ہوتی تھی یہیں ہوتی تھیں۔میر معظم حسین نے اپنے بچوں کو ایک دن بتایا کہ وہ اور ان کے ساتھی بچے کیسے جھانک جھانک کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھے لوگوں کو دیکھا کرتے تھے۔اسی ڈائننگ روم میں معظم حسین صاحب اور ان کی بہنیں اسکیٹنگ کیا کرتے تھے ارم نما کی سیڑھیوں کا جو نقشہ ہے وہ فرانس کے Fountain Blue کے نقشے پر ہے۔معظم حسین صاحب اپنے بچوں کو وہاں لے جاتے اور بتاتے کہ کیا کیا کھیل وہ لوگ وہاں کھیلتے تھے۔کتنا لطف اٹھاتے تھے کیسے باغ کی نگرانی کرتے تھے۔باغ اور باغبانی کا یہ شوق ان کے بچوں میں بھی ویسا ہی آیا ہے۔

نواب میر معظم حسین سیول سرویس میں تھے جب بھی کوئی ان کی سیول سرویس کا ساتھی ہندوستان سے آتا تو ان ہی کا مہمان ہوتا تھا اس میں سے ایک جئے کمار اٹل بھی تھے۔جو جئے پور کے خاندان سے تھے ارم نما کے مہمان خانے میں انہیں ٹھہراتے تھے۔معظم حسین صاحب ان اصحاب کی خوب خاطر تواضع کرتے اور اپنے خاندان والوں سے ملاتے تھے۔ان میں کمال یار جنگ اور نواب سالار جنگ سے ضرور ملواتے تھے ایک دن نواب کمال یار جنگ نے اٹل صاحب کو دوسرے دن ناشتے پر بلوایا۔جب وہ ناشتہ کے لیے دیوڑھی کمال یار جنگ گئے تو کمال یار جنگ کے ADC انہیں ڈریسنگ روم لے گیا بڑے ادب سے کہا آپ تیار ہو جائیے۔وہ حیران ہو گئے تیار تو ہوں اور کیا چاہیے ADC نے ایک کشتی جو مخمل کی تھی کھولی اس میں شیروانی نکال کر دی کہا اسے زیب تن فرمائیے۔اٹل جی حیران رہ گئے کہ شیروانی بالکل ان کے سائز کی تھی۔نواب صاحب کے درزی نے رات بھر بیٹھ کر یہ شیروانی تیار کی تھی وہ اس فن میں اتنا ماہر تھا کہ اس نے صرف نظر سے ناپ لے لیا اور شیروانی تیار ہو گئی۔یہ قصہ سنا کر اصغر صاحب کے والد نے کہا یاد رکھنا جب بھی تمہارے پاس کوئی مہمان آئے اس کی خاطر ایسی اور اس طرح کرنا کہ وہ بھول نہ سکے یہ تہذیب ہماری ہے ہمارے دکن کی ہے۔

اصغر حسین کا بچپن نانا (آغا حیدر حسن) کے ساتھ بہت گزرا وہ بھی ایک عجیب وغریب ماحول تھا۔آغا حیدر حسن کو اپنی اردو پر ناز تھا جسے وہ اردوئے معلیٰ کہتے تھے اسی اردوئے معلیٰ میں وہ بات کرتے تھے۔جب بھی ان سے ملنے کوئی دوست یا شاگرد آتا تو وہ غیر معمولی شوق سے اس سے ملتے تھے۔یہ بچے ان کے شوق کو دیکھ کر حیران رہ جاتے تھے، نانا یعنی آغا صاحب اپنے مہمانوں کو تہہ خانے میں لے جاتے تھے جہاں ساگوان کی کئی الماریاں تھیں ایک الماری میں آغا صاحب کے بچپن کے کھلونے بڑے ہی سلیقے سے سجے ہوئے تھے یہ کھلونے وہ تھے جو آغا صاحب کو ان کے نانا، دادا نے دیئے تھے۔یہ کھلونے غدر سے پہلے کے بھی تھے اور بعد کے بھی۔ان میں کچھ ''سپاہیاں'' تھے یہ ''سپاہیاں'' مغل بھی تھے اور انگریز کچھ اور چیزیں بھی تھیں چائے کا سامان، خوب صورت چینی

کے مشقاب، گڑیاں، میانے، چوڑیاں، فاختے، کبوتر طرح طرح کے جانور پریاں بت اور جانے کیا کیا۔ اصغر صاحب نے کہا کہ ان میں نہ سلیقہ نہ شوق بس ایک بچے کی ضد ہوتی تھی اسے نکالیں دیکھیں وہ الماری کھولتے سب چیزیں نکالتے کھیلتے پھر ادھر اُدھر پھینک دیتے تھے۔ آغا صاحب ان بکھری ہوئی چیزوں اور کھلونوں کو سمیٹتے اپنی اپنی جگہ پر رکھتے۔ آغا صاحب مہینے میں ایک بار اپنی پیٹھیاں کھولتے ان میں شیروانیاں، خریدے ہوئے شیروانی کے کپڑے ہوتے تھے انہیں نکال کر وہ دھوپ دیتے پھر نیم کے پتے پٹھیوں میں بچھا کر انہیں سلیقے سے رکھ دیتے تھے۔

جاڑوں کے موسم میں حیدر منزل میں پیپل کی چھاؤں میں ایک بڑا سا تانبے کا قلعی کیا ہوا دیگچہ چولھے پر چڑھا ہوتا تھا لکڑیوں کی آگ ہوتی تھی۔ اس دیگچے میں حبشی حلوہ بنوایا جاتا تھا جو دہلی کے خاندانی نسخے پر تیار کیا جاتا تھا جس میں ہمہ قسم کے سوکھے میوے اخروٹ، بادام، پستے، چرونجی، کاجو، زعفران، الائچی وغیرہ وغیرہ اور پتہ نہیں کیا کیا شامل کیا جاتا تھا۔ بہت مزے کا ہوتا تھا جاڑے کے موسم کے لحاظ سے مقوی ہوتا تھا کئی دن تک بچے بڑے کھاتے دوستوں میں تقسیم ہوتا تھا۔

حیدر منزل میں ہر بچہ کے نام سے ایک ایک آم کے جھاڑ بوئے جاتے تھے۔ درخت بڑے ہوئے پھل آیا تو بچوں میں ایک مقابلہ ہوتا تھا کہ کس کے درخت کے آم میٹھے اور مزے دار ہیں کس کی کیریاں بڑی ہیں اور کس کے درخت پر پہلے بور آیا ہے کس کے درخت پر پہلے پھل لگا ہے پھر ان کیریوں کا اچار بنتا رشتہ کا اچار، نورتن کا کھٹا میٹھا اچار، مربہ، سب کو یہ فکر کہ ہماری کیری کا اچار مزیدار ہوا اور اچھا۔ ایسا تھا بچپن ان کا۔

آغا حیدر حسن مرحوم کو جانوروں کے پالنے کا بڑا شوق تھا ہر بچے کے نام سے ایک بھینس پال رکھی تھی جس کی بھینس ہے وہی ان کا دودھ پیئے وہی بچہ اس بھینس کی خدمت بھی کرے صاف رکھے۔ ان میں سے ایک آغا صاحب کی بہت چہیتی بھینس تھی۔ اس کا نام تھا گوری۔ جانور بھی محبتوں کو پہچانتے ہیں وہ بھی سب سے محبت کرتی تھی آکے چاٹتی تھی۔ دوسرے جانوروں میں ان کے یہاں پانسو سے زائد کبوتر تھے نہیں اصغر حسین اور دیگر بھائی بہنیں صبح وشام دانہ ڈالتے عجیب عجیب ہمہ قسم کے کبوتر تھے۔ ان کے نام بعض تاریخی شخصیتوں پر رکھے گئے تھے جسے سلیماں بادشاہ، زینت محل، زینت النساء بیگم، چوزی بیگم، گل بدن، بوّا، گلشن بی، کمال النساء، بی بی، رحمت بی اور ان پرندوں کی عجیب وغریب خوبی یہ تھی کہ ہر کبوتر اپنے نام سے آشنا تھا۔ تم سے بلائیں تو آتا اور ہاتھ پر بیٹھتا تھا۔ آغا صاحب نے بندر، چینی مرغ، اصیل مرغ، مرغیاں، خرگوش بھی پال رکھے تھے۔ ان کے بھی نام تھے اصغر صاحب کے نانا انہیں نام سے بلاتے تو دوڑے چلے آتے۔ اصغر حسین صاحب کا کہنا ہے کہ ''ہم خوش نصیب ہیں کہ ہم کو ایسا ماحول ملا۔ وقت کے ساتھ ساتھ موسم کے ساتھ ساتھ کھیل کے سامان بھی بدلتے رہتے میں بیر بہوٹیاں، تتلیاں، پاترنیاں بھنورے، جگنو یہ بھی تو معصوم کھیلوں کا حصہ تھے۔ بھنورے کے گلے میں تاگا باندھ کر اڑاتے پاترنیوں کی دم میں تاگا باندھ کر پتنگ کی طرح اڑاتے تھے۔ کبھی کبھی کوئی آغا صاحب کے پاس گوڑ پھوڑ لاتا تو نانا اسے رسی باندھ کر دیوار پر چڑھاتے اور کہتے چلو رسی پکڑ کر چڑھو حیدر منزل میں درخت ہی درخت ہمہ قسم کے پھولوں کے پودے بڑ باغل (چمگاڈر) کا رات میں شور ہوتا اسے بھی جکڑتے یہ بچے اسے بھی ڈوری باندھ کر اڑاتے تھے۔

آغا حیدر حسن ہمیشہ شیروانی میں رہا کرتے تھے۔ اپنے نواسوں کو شیروانیوں کا شوق ان ہی سے ملا ہے۔ وہ ان بچوں سے کہا کرتے تھے تمہاری شیروانی سب سے الگ ہونی چاہیے۔ ان بچوں کو ساتھ لے جاتے تو لوگ حیران ہوتے تھے اتنے چھوٹے بچوں کی ایسی غیر معمولی اور قیمتی شیروانیاں کیوں، کہاں سے آئیں، سب لوگ یہ سمجھتے تھے آغا صاحب کی دولت چھپی ہوئی ہے مگر وہ

لوگ یہ نہیں جانتے تھے کہ ان کی حیثیت یونیورسٹی کے ایک پروفیسر کی تھی۔

1954ء میں میر معظم حسین صاحب لندن گئے وہاں سے انہیں پیرس بلایا گیا گونڈوں کے ساتھ جو میر معظم حسین نے کام کیا تھا اس کا بڑا چرچا تھا گونڈی زبان کا کوئی رسم الخط نہیں تھا انہوں نے گونڈی کو دیوناگری میں لکھنے کا ہنر سکھایا۔ ان کی کوششوں ہی کی وجہ سے UNESCO کے صدر نے ان کا انٹرویو لیا۔ وہاں سے وہ لیبیا گئے حیدرآباد سے ان کی فیملی بھی لیبیا گئی۔ وہاں سفارت تعلیم میں ایک ماہر تعلیم کی ضرورت تھی تو معظم حسین کو بلوایا گا۔ جب معظم حسین صاحب وہاں سنبھل گئے تو بیگم مہرالنساء اپنے پانچ بچوں کے ساتھ لیبیا پہنچ گئیں۔ اس زمانے میں یہ سفر بہت دور کا تھا بہت مشکل بھی تھا۔ 1954ء میں بیگم پیٹ ایئر پورٹ پر ڈکوٹا طیارہ تک ہمیں چھوڑنے کے لیے اصغر حسین کے دادا نواب رئیس جنگ اور نواب خسرو جنگ، نواب حبیب جنگ، نواب مجیب جنگ، نانا آغا حیدر حسن اور رشتہ دار دوست احباب طیارے کے دروازے تک آتے بعض تو ہمیں سیٹ پر بٹھا کر ان بچوں کو ہوائی جہاز میں بیٹھنے کا ڈر تھا اور اشتیاق بھی۔ خسرو جنگ بچوں کو اطمینان دلاتے رہے اور بیگ مہرالنساء کو سمجھاتے رہے اس وقت اصغر حسین کی چھوٹی بہن نو مہینے کی تھی خسرو جنگ نے مہرالنساء کی گود میں بچی کو بٹھایا پرواز کا وقت آیا تو سبھوں نے خدا حافظ کہا۔ ٹریپولی تک پہنچے۔ میں دو دن لگے وہاں سے ایک رات گزری قاہرہ پہنچنے میں۔

اصغر حسین کی تعلیم گرامر اسکول میں ہوئی اس کے بعد لیبیا کے ملٹری اسکول میں۔ یہ چاروں بچے ہی وہاں غیر انگریزی تھے دو سال بعد اصغر حسین کے بڑے بھائی کی پوری تعلیم انگلستان میں ہوئی۔ مجھلے بھائی اور اصغر حسین کی تعلیم انگلستان مالٹا کے Edward کالج میں ہوئی جو بہت مشہور تھا۔ مالٹا اس لیے گئے کہ مالٹا، لیبیا سے بہت قریب تھا صرف دیڑھ گھنٹے کی فلائٹ تھی۔ اصغر صاحب کی والدہ بچوں کو اپنے پاس رکھنا چاہتی تھیں۔ اچھی تعلیم کے لیے انہیں دور رکھنا پڑا۔ اصغر کی بہنوں کی ابتدائی تعلیم بھی لیبیا میں ہوئی پھر ان کی بہن فاطمہ شہناز کی تعلیم سوئٹزرلینڈ کے مشہور اسکول Chelallod میں ہوئی تھی۔ چھوٹی بہن ٹریپولی ہی میں تھی۔ 1964ء میں میر معظم حسین کا تبادلہ UNESCO پیرس کے ہیڈ کوارٹر میں ہوا۔ اصغر حسین کی بڑی خواہش تھی کہ Lough boraough Technical Institute میں ٹریننگ حاصل کریں۔ آرٹ اور کرافٹ میں ان کا شوق تھا جو ان کے نانا کی صحبتوں کا اثر تھا۔ مگر اس وقت ان کی عمر اتنی نہیں تھی کہ داخلہ مل سکے تو پھر سینئر کیمبرج کے لیے انگلستان گئے۔ 1965 میں پیرس کی مشہور یونیورسٹی Policital Institute کامیاب کیا یہاں سے ڈپلوما کے بعد اعلیٰ درجے کی نوکری سیول سرویس کے مماثل مل جاتی تھی۔ اس دوران میر اصغر حسین کی دوستی وہاں کے خاص علمی خاندانوں، مشہور شخصیتوں ، سیاست دانوں اور صنعت کاروں سے ہوتی اس Political ادارے میں Degaulle پریسیڈنٹ آف فرانس نے بھی تعلیم حاصل کی تھی اس تعلیم اور اس ماحول سے اصغر حسین پر ترقی کے دروازے کھل گئے UNESCO کے اعلیٰ عہدوں پر قایم رہتے۔ دنیا جہاں کے مقتدر شخصیتوں سے تعلقات کے باوجود، اردو زبان، ادب اردو تہذیب ملکی اور خاندانی اقدار کے میر اصغر حسین علم بردار ہیں۔

☆☆☆

رعائتی نرخ پر

ادیبوں وشاعروں کی کتابوں کے اشتہارات

''سب رس'' میں شائع کیے جاتے ہیں۔

افسانہ

یسین احمد

زرگزیدہ

باپ کا کفن ابھی میلا نہ ہوا تھا کہ جائیداد کا بٹوارہ شروع ہوگیا۔

باپ چلتے پھرتے دُنیا سے چل بسا تھا۔اتنی مہلت نہیں ملی تھی کہ وصیت لکھ جاتا۔باپ کی ناگاہ موت نے ماں پر سکتہ طاری کردیا تھا۔یوں چپ ہوگئی تھی جیسے قوت گویائی سے محروم ہوگئی ہو۔لب شاخ سے ٹوٹ کر گرے ہوئے پتوں کی طرح سوکھ گئے تھے۔آنکھیں صحرائی میدان بن گئی تھیں۔سب دیکھ رہی تھی۔سن رہی تھی مگر خاموش.....

منجھلے بیٹے نے کہا۔''مجسٹریٹ کالونی کا بنگلہ مجھ کو بہت پسند ہے۔میں رکھ لو...؟''

ماں خاموش رہی۔

چھوٹے بیٹے نے کہا۔''معین آباد کے فام ہاوس پر میں نے بہت محنت کی ہے۔اگر آپ چاہیں تو.........''

ماں خاموش رہی۔

بڑا بیٹا بڑا سیانا تھا۔ہمیشہ تر نوالے چبانے کا عادی رہا۔خشک گھاس پر منہ مارنا نہیں سیکھا۔وہ بولا۔''امی اس مکان میں ہمارا بچپن گزرا ہے،میں یہیں رہوں گا۔کہیں نہیں جانا ہے....''

ماں خاموش رہی۔

جس مکان میں سب کی سکونت تھی وہ تین منزلہ تھا۔نچلے حصے میں پورا کنبہ آباد تھا۔دوسرا اور تیسرا پورشن باپ کی زندگی ہی میں کرایہ پر اٹھا دیا گیا تھا۔معقول کرایہ آرہا تھا۔اس گھر کو آباد کرنے کے لئے ماں باپ نے تیس بتیس سال محنت کی تھی۔تنکا تنکا جوڑ کر جو آشیانہ بسایا تھا وہ اب اُجڑنے کو تھا۔ماں کو گزری ہوئی زندگی کا ہر واقعہ یاد تھا،سہاگ رات سے بیوگی کے آخری لمحات تک........ہر بات،ہر یاد متحرک تصویروں کی مانند آنکھوں میں اُتر آئی تھی۔ان دونوں نے اپنی اولاد کی خاطر اپنے جذبات،اپنی خواہشات اور خوشیوں کو تیاگ دیا تھا۔شادی کے بعد بہت کم عرصے تک دونوں ایک دوسرے کے ساتھ رہے۔دو بچے ہوئے ماں بچوں کی دیکھ بھال میں الجھ گئی اور باپ ملازمت کے چکر میں پھنسا رہا۔

باپ سرکاری ملازم تھا۔اعلیٰ عہدہ پر فائز تھا۔مگر وقتاً فوقتاً تبادلے ہوتے رہتے تھے۔کبھی یہاں تو کبھی وہاں۔کبھی اِس شہر میں تو کبھی اُس ضلع میں۔کبھی ہوٹل میں ٹھہرنا پڑا تو وہیں کھایا پیا اور سویا۔کبھی من پسند کا مکان مل گیا تو لے لیا۔سرکار کی جانب سے بہت سی سہولیتیں مہیا تھیں کار،ڈرائیور اور ایک چپراسی۔لیکن انسان کی مادی ضرورتوں کے علاوہ کچھ اور ضرورتیں بھی ہوتی ہیں جن کی تکمیل وہاں ممکن نہیں تھی۔اس لئے جب تعطیلات ملتے بھاگا بھاگا یوں گھر چلا آتا جیسے کسی زنداں سے نکل کر مرغزاروں میں آگیا ہو۔تعطیلات کے مختصر اور محدود لمحے بیوی بچوں کے ساتھ گزرتے تو طبیعت باغ باغ ہوجاتی۔ڈیوٹی پر لوٹتے وقت ایک نامعلوم سی اداسی کی تہہ چہرے پر جمی سی رہتی۔

پنشن تک زندگی ایسے ہی گزری۔

بچے بڑے ہوگئے۔تعلیمافتہ ہوگئے۔خوش قسمتی سے اچھی ملازمت مل گئی۔بڑا بیٹا ریاض میں تھا اور دونوں اپنے ہی شہر میں ملازمت کررہے تھے۔خوبصورت اور بے مثال بہویں بھی مل گئیں۔کافی ہاتھ پاؤں مارنے کے بعد بڑے بیٹے کو فیملی ویزا بھی ہاتھ آگیا۔اُس نے ماں باپ سے بیوی کو ساتھ لے جانے کی اجازت مانگی۔شادی شدہ ہوتے ہوئے بھی مجردانہ زندگی گزارنے کا عذاب کیسا ہوتا ہے یہ ماں باپ خوب جانتے تھے۔چنانچہ انہوں نے اجازت دے دی۔بیٹا بیوی کو لے کر ریاض چلتا بنا۔

وظیفہ پر سبکدوش ہوتے ہی ماں باپ نے حج کی سعادت حاصل کی۔ پہلی بار وہ دونوں ملک سے باہر گئے تھے۔ حالانکہ باپ کو دُنیا دیکھنے کی بہت خواہش تھی۔ ملازمت کے دوران کہیں نہیں جا سکا تھا۔ مگر پنشن کے بعد آزاد ہوا تو اُس نے ماں سے کہا۔

''چلیئے پیرس جائیں گے۔ سنا ہے ایفل ٹاور دیکھنے دُنیا بھر سے لوگ آتے ہیں۔''

''کینڈا چلیں گے۔ نیاگرا آبشار قابل دید مقام ہے۔''

''سنگا پور خوبصورت شہر ہے یہاں سے دور بھی نہیں کچھ دن اگر وہاں بیت جائیں تو کیا بُرا ہے۔''

ماں سب سنتی مسکراتی، اور ٹھنڈے لہجے میں کہتی ۔''اب کیا کریں گے وہاں جا کر۔''

اور پھر وہ آنکھوں پر چڑھی ہوئی عینک کو نیچے اوپر کرتی، پیر پسار کر گھٹنے دبانے لگتی یا کمر پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ لیتی۔ حالانکہ وہ اتنی ضعیف بھی نہیں ہوئی تھی کہ کہیں جا نہ سکے۔ دراصل وہ نہیں چاہتی تھی کہ جوانی میں جس پیسہ کو انہوں نے محنت سے کمایا ہے، مشکل سے بچایا ہے وہ اب سیر و تفریح پر خرچ کر دیں۔ یہ دولت اُن کی اولاد کے کام آ سکتی تھی۔ آنے والی نسل کے کام آ سکتی تھی۔

مگر آج اسی دولت کے بٹوارے کے لئے اولاد بے تاب تھی۔

بٹوارے کی بات سارے خاندان میں پھیل گئی۔ خاندان کے کچھ سنجیدہ بزرگ بھی اُن کو سمجھانے چلے آئے۔ ایک بزرگ نے کہا۔''بیٹے بٹوارے کی ابھی اتنی جلدی بھی کیا ہے۔ ماں کے عدت کے دن پورے نہیں ہوئے۔''

تیسرا بیٹا بھائی کے کندھے پر بندوق رکھ کر گولی چلانے کا عادی تھا۔ فوراً بولا۔''دراصل بھائی صاحب کو بڑی مشکل سے رخصت ملی ہے۔ کیا پتہ اُن کو کب آنا ہو۔''

انسان اور طوطے میں بڑا فرق ہے۔ طوطے کو سب کے سامنے جو رٹایا جاتا ہے وہ محفل میں فوراً بول دیتا ہے اور انسان کو خلوت میں جو سکھایا جاتا ہے وہ موقع محل دیکھ کر بولتا ہے۔ تیسرا بولا۔''آپ جانتے ہیں نوٹ بندی کے بعد کیا کیا تبدیلی آئی ہے۔ کسی جائیداد کی خریدی یا منتقلی میں کئی پیچیدگیاں آ رہی ہیں۔''

بیٹے پہلے غیر منقولہ جائیداد کی تقسیم چاہتے تھے۔ جو منقولہ مال و زر تھا وہ بینک کے سیف لاکر میں محفوظ تھا۔ لاکر ماں کے نام تھا اور ماں عدت کے بعد ہی لاکر کھول سکتی تھی۔ بڑا بیٹا بولا۔''ہم صرف Unmovable جائیداد کی بات کر رہے ہیں۔ سیف لاکر تو امی کے نام پر ہے' اُس میں جو کچھ بھی ہے اُس پر ان کا ادھیکار ہے وہ جس کو چاہیں دے دیں۔''

بزرگ کو خاموش ہونا پڑا۔ جو دلیل دیئے گئے تھے وہ معقول تھے۔ نوٹ بندی کے بعد ملک میں انتشار آ گیا تھا۔ نئے نئے قانون بن رہے تھے۔ بڑے بڑے مگرمچھوں کو چھوڑ دیا گیا تھا اور چھوٹی چھوٹی مچھلیاں جال میں پھانسی جا رہی تھیں۔

ماں مختصراً بولی۔''آپ لوگوں کی مرضی جو مناسب سمجھیں کریں۔''

ماں سے جیسے اجازت مل گئی تھی۔ وصیت لکھنے میں کتنا وقت لگتا ہے؟ ایک وکیل نے معاوضتاً یہ مرحلہ بھی طئے کر دیا۔ بڑے بیٹے نے وصیت نامہ ماں کے حوالے کر دیا۔ ماں نے وصیت نامہ دیکھے بغیر اپنے سرہانے رکھ لیا۔

ایک دن گزر گیا۔ ماں نے وصیت نامہ کے بارے میں کوئی گفتگو نہیں کی۔ اُن کے چہرے مہرے سے بھی کچھ اندازہ لگانا مشکل تھا۔ بیٹے اور بہوؤں کے چہروں پر ہوائیاں اُڑنے لگیں۔ بند کمروں میں بیٹھ کر آپس میں کانا پھوسی کرنے لگے۔ سب کو احساس تھا کہ ماں جتنی شفیق ہے اتنی ہی سخت گیر بھی ہے۔ آج تک اُن کی زندگی کے جتنے بھی اہم فیصلے ہوئے تھے اُن پر ماں ہی

کے دستخط ثبت تھے۔ تیسری صبح وہ تینوں ماں کے کمرے میں پہنچے۔ماں نے وصیت نامے پر دستخط کر دیئے تھے اور وصیت نامہ پر ہی لکھ دیا تھا۔

''جائیداد کا بٹوارہ ہو چکا۔اب ماں کا بٹوارہ نہ کرنا۔''

تبھی اُن کو احساس ہوا کہ سامنے جو جسم پڑا تھا وہ بے جان ہے۔

Yaseen Ahmed

17-2-1159/2, Wahed Colony,

India Function Hall Lane, Post,

Yakutpura,

Hyderabad - 500 023. A.P. India.

یٰسین احمد

گارڈ فادر

۱۶رفروری ۲۰۱۸ء کی صبح تھی۔

صبح خوش گوار تھی۔لیکن بنارس کی طرح حسین تھی اور نہ کشمیر کی طرح سرد ترین۔یہ دکن کی صبح تھی...متعدل.....جہاں کے صرف باسی ہی نہیں موسم بھی اعتدال پسند ہیں۔میں مارننگ واک سے لوٹا تھا۔نہا کر غسل خانے سے نکلا۔تولیے سے بدن خشک کرتے ہوئے اچانک میری نظر بستر پر پڑی تو تن بدن میں آگ لگ گئی۔

بستر پر آج کا اخبار پڑا تھا میں نے ہمیشہ حسن سلیقہ کو ترجیح دی ہے۔اگر آپ کے موزے،تکیوں پر پڑے ہوئے ہوں اور انڈوں کی ٹرے ٹی وی کے ٹاپ پر ،کتابوں کے شلف میں اتارے ہوئے کپڑے ٹھونسے ہوئے ہوں تو موڈ بگڑنا لازمی ہے کیونکہ یہ سلیقہ نہیں۔بدتہذیبی ہے۔اخبار کو وہاں سے اٹھا کر اسی کی اپنی مختص جگہ پر رکھنا چاہا تو میری نظر اخبار کی اس سرخی پر پڑی۔

''فلوریڈا کے اسکول میں سابق طالب علم کی فائرنگ، 17 ہلاک۔''

سرخی اتنی سنسنی خیز تھی کہ میں نے اسی حالت میں ساری خبر پڑھ لی۔جس کا لب لباب یہ ہے کہ فلوریڈا کے ایک ہائی اسکول میں ایک سابق طالب علم اسالٹ طرز کی رائفل کے ساتھ زبردستی داخل ہو گیا اور اندھا دھند فائرنگ شروع کر دی جس کے نتیجہ میں 17 افراد ہلاک اور 12 سے زیادہ زخمی ہو گئے۔19 سالہ ہندوستانی نژاد امریکی طالب علم کی بحیثیت نیکولس کروز شناخت کر لی گئی تھی۔

یہ تو اچھا ہوا کہ قاتل غیر مسلم ہے۔اگر مسلمان ہوتا تو دنیا بھر کے اخبارات اور ٹی وی چینلس پر کہرام مچ جاتا۔متعصب ٹی وی والے یہ تک کہہ دیتے کہ اس حادثے میں فلاں دہشت گرد مسلمان کا ہاتھ ہے۔فلاں اسلامی سنگھٹن نے اس کی ذمہ داری بھی قبول کر لی ہے۔

جب کسی دو ملکوں کے درمیان جنگ ہوتی ہے تو دواخانے،اسکول اور ہائشی مقامات پر حملے نہیں کئے جاتے۔لیکن یہ کیسا دور آ گیا ہے کہ اسکولوں،اسکول کی بسوں پر قاتلانہ حملے کئے جاتے ہیں۔امن پسند اذہان کے لئے اس قسم کی خبریں روح فرسا ہوتی ہیں۔

میں نے اپنے بطن میں تلخی محسوس کی۔اخبار میں اور بھی سرخیاں تھیں۔مثلاً پنجاب نیشنل بینک میں 11400 کروڑ روپے کا اسکام،صدر ایران حسن روحانی کی آمد،اور بی جے پی نے ہندوتوا رگ دلانے کے علاوہ کچھ نہیں کیا۔یہ سب سرخیاں سیاسی نوعیت کی تھیں جن سے مجھ کو کوئی سروکار نہیں۔

بیوی کے ساتھ ناشتہ کیا لیکن رغبت محسوس نہیں ہوئی۔تساہل سے بیٹھا رہا تو بیوی نے یاد دلایا۔''آج آپ کو بینک جانا ہے۔مجھ کو یقین ہے آپ کو قرض منظور ہو جائے گا۔''

احمد فراز نے اپنے محبوب کی شان میں قصیدہ پڑھا تھا کہ بات کرے تو پھول جھڑتے ہیں۔مگر آج تک کسی شاعر نے یہ نہیں کہا تھا کہ حسین عورت کی زباں سے نکلا ہوا کوئی مکالمہ اچھا شگون ثابت ہوسکتا ہے؟

میں پیکنگ میٹریل بنانے کا کارخانہ چلاتا ہوں۔پچھلے گیارہ بارہ برسوں سے کارخانہ چل رہا ہے جہاں دس بارہ ورکس کام کرتے ہیں۔سارا کام مینول (Manual) طریقے پر ہوتا ہے۔ایک عرصے سے سوچ رہا ہوں کہ کارخانے کو جدید ٹکنالوجی کے مطابق ہم آہنگ کروں۔سرکار نے ترقیاتی کاموں کے لئے یوجنائیں بنائیں اور بینک سے قرض لینے میں سہولتیں فراہم کیں اسی سہولت سے استفادہ اُٹھانے کے لئے میں نے بھی قرض کے لئے اپنے بینک میں درخواست دے دی۔اس بینک میں برسوں سے میرا کھاتہ چل رہا تھا۔

جس عمارت میں میرا کارخانہ قائم ہے وہ عمارت میری ذاتی ملکیت ہے۔جس مکان میں مقیم ہوں وہ مکان میرا اپنا ہے۔انکم ٹیکس، سیلز ٹیکس اور دوسرے دیگر ٹکس کی ادائیگی میں مَیں نے کبھی ٹال مٹول نہیں کیا۔آدھار کارڈ
،پین کارڈ،راشن کارڈ، ڈیبٹ کارڈ،اے ٹی یم کارڈ جتنے بھی کارڈس ہیں وہ سب میں رکھتا ہوں۔یہاں تک کچھ پوسٹ کارڈس بھی میرے پاس مل جائیں گے۔کیا پتہ کب اور کس کارڈ کی ضرورت پڑ جائے۔جس دن قرض کے لئے درخواست داخل کی اُس درخواست میں ان سارے کارڈس کی زیرکس کاپی منسلک کردی۔

بینک کے ذمہ دار افراد نے میرے کارخانے کا دورہ کیا 'ہر طرح کی معلومات اکٹھا کیں۔میری رہائش گاہ پر بھی حاضر ہوئے۔جتنے بھی کاغذات بینک والوں نے مانگے میں نے فائل کردی۔ لائٹ کا بل کی کاپی، بلدیہ ٹکس کی رسید سبھی قسم کے دستاویزات میں نے فائل کیا۔قرض کے لئے فائل کی ہوئی میری درخواست پچھلے کئی ہفتوں سے ان لوگوں کے پاس زیرغور ہے۔

اسی سلسلہ میں آج بینک جانا تھا۔بیوی کی پُر امید بات سے کچھ ہمت بندھی۔بینک پہنچ گیا۔پہلے استفسار کاونٹر پر بیٹھی ہوئی محترمہ سے ملا۔محترمہ خوبصورت تھیں۔اس نے بڑی خوبصورتی سے کیشیر سے ملنے کے لئے کہا۔میں کیشیر سے ملا۔کیشیر خار کھائے بیٹھا تھا اور نظریں کمپیوٹر پر جمی ہوئی تھیں۔شاید کمپیوٹر کے ساتھ ساتھ اس کا سرور بھی ڈاؤن تھا۔اس نے کمپیوٹر سے نظر ہٹائے بغیر اسسٹنٹ منیجر سے ملنے کے لئے کہا۔اسسٹنٹ منیجر نے میری کچھ سنے بغیر منیجر کے کمرے میں ڈھکیل دیا۔

منیجر کے کمرے کا اے سی کھلا تھا۔کمرہ ٹھنڈا تھا اور مہک رہا تھا۔جیسے اس مندر میں آ کر اس نے ابھی ابھی
اگر بتیاں جلائی ہوں۔منیجر کے کمرے میں ایک اور بندہ پہلے سے ہی موجود تھا میں نہیں جانتا تھا کہ وہ بندہ کون ہے؟ میری ہی طرح کوئی ضرورت مند یا پھر بینک کا ہی کوئی کرم چاری۔منیجر نے اس بندے کے برابر پڑی ہوئی کرسی پر بیٹھنے کا مجھ کو اشارہ کیا۔میں بیٹھ گیا۔

منیجر نے کچھ سنے بغیر کال بیل بجائی۔ایک قبول صورت خاتون کا چہرہ نیم وا دروازے سے جھلملایا تو اُس نے چائے لانے کے لئے کہہ دیا۔

کچھ دیر میں شفاف پیالیوں میں گرم گرم چائے اور چمکتی گلاس میں پانی لا کر اس نے میز پر رکھا اور مشینی انداز میں کمرے سے باہر نکل گئی۔منیجر نے چائے لینے کا اشارہ کیا۔میز سے چائے کا کپ اٹھاتے ہوئے میں نے کہنا شروع کیا۔''آج آپ نے آنے کے لئے کہا تھا....!''

صرف اتنا ہی کہا تھا کہ مجھ کو خاموش ہو جانا پڑا کیونکہ میز پر رکھا ہوا منیجر کا فون چلاّیا تھا۔اس نے فوراً فون اٹھالیا جس انداز میں وہ محوِ کلام تھا میں سمجھ گیا کہ فون اُس کے ہیڈ آفس سے آیا ہے اور کوئی بالائی سطح کا آفیسر گفتگو کر رہا ہے۔

بار بار یس سر، یس سر کہنے کا سلسلہ ٹوٹا تو منیجر کا چہرہ اتر

گیا تھا مجھے لگا کہ یکبارگی سارا منظر بدل گیا ہے۔چائے کی پیالیوں میں گرماہٹ باقی رہی اور نہ منیجر کے چہرے پر رونق۔

''آپ لوگوں نے ٹی وی پر کل خبریں دیکھیں؟''

کچھ پل کے توقف سے منیجر نے پوچھا۔''آج کا اخبار بھی پڑھا ہوگا۔''

مجھے صبح اخبار میں پڑھی ہوئی خبریں یاد آ گئیں۔فلوریڈا کے اسکول کے بچوں پر فائرنگ کا حادثہ اتنا متاثر کن تھا کہ میں نے دوسری سرخیوں پر توجہ نہیں دی تھی۔میرے پہلو میں بیٹھے ہوئے بندے نے پوچھا۔''آپ پنجاب نیشنل بینک کے گھٹالے کی بات کر رہے ہیں، جو ہیرے کے بیوپاری نے 11600 کروڑ روپے کا اسکام کیا ہے۔

''ہاں۔''منیجر نے کہا۔''اس اسکام نے سارے بینکوں میں ہلچل مچادی۔ابھی ابھی میرے صدر دفتر کے ایک افسر نے ہدایت دی ہے کہ میں سارے قرضوں کی فائل التواء میں رکھ دوں۔کچھ دنوں میں ضروری ہدایتیں جاری کریں گے۔''

میرا دل بیٹھ سا گیا۔اُمید کی جوت بجھتی ہوئی محسوس ہوئی۔اس قرض کے لئے میں کئی دنوں سے بینک کے چکر کاٹ رہا تھا۔پیروں کے جوتے گو نہیں گھسے تھے لیکن میری بائیک کے ٹائر ضرور متاثر ہوئے تھے۔میں ایک عام آدمی کی طرح ہوں۔یعنی میڈل کلاس سٹی زن... جو اُمید اور بیم کے درمیاں ہمیشہ جھولتا رہتا ہے۔کبھی اِدھر اور کبھی اُدھر...فٹ پاتھ پر سو نہیں سکتا اور محل نصیب نہیں ہوتے۔صرف خواب دیکھ سکتا ہوں اور اسی خوابوں میں جیتا مرتا رہتا ہوں۔

میرے برابر بیٹھا ہوا بندہ بولا۔''سر! ہم لوگوں کو ہزار یا کچھ لاکھ روپے کا قرض آسانی سے نہیں ملتا! لیکن بڑے لوگ کڑور کا گھٹالہ کر کے ملک سے فرار ہو جاتے ہیں۔پہلے وجئے مالیا، پھر للت مودی اور اب یہ ماموں بھانجے ..کل پھر کوئی اور اسکام سامنے آئے گا۔''

میرے لئے بھی اس قسم کے واقعات نئے نہیں ہیں۔میری طالب علمی کے دور میں بھی اس شہر میں ایسا واقعات ہوئے ہیں۔حیدرآباد ویلفیر سوسائٹی، حیدرآباد چٹ فنڈ، حیدرآباد ہاوسنگ سوسائٹی، الفلاح کمپنی، چارمینار کوپریٹو بینک، کتنے متوسط درجہ کے خاندان کا روپیہ ڈوب گیا اور قانون ان کا کچھ بگاڑ نہ سکا۔آہستہ آہستہ یہ سارے واقعات ہمارے ذہنوں سے نکل جاتے ہیں۔صرف اس ایک شہر میں ہی نہیں اس ملک کے ہر بڑے شہر میں ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔

منیجر نے کہا۔آپ لوگ ایک دو ہفتے انتظار کریں۔دیکھیں ہائی اتھاریٹز کیا ہدایت دیتے ہیں۔''

میں نے میز پر سے اپنی فائل اٹھائی اور کمرے سے باہر نکل گیا۔کچھ قدم چلا تو احساس ہوا وہ بندہ بھی میرے پیچھے چلا آرہا ہے اور پھر وہ تیزی سے قریب آکر قدم بہ قدم چلنے لگا اور پوچھا۔''آپ کا کوئی گارڈ فادر ہے....؟''

مزاج میں رچی ہوئی تلخی کو مٹانے کے لئے میں نے کہا۔''ایک فادر تھا جو برسوں پہلے نذرِ خاک ہو گیا اور گارڈ...وہ آسمان پر ہے اور آج کل زمین پر کم کم دیکھتا ہے۔''

میری بات سے وہ بدمزہ نہیں ہوا اور سنجیدگی سے بولا۔''میرا مطلب ہے کوئی بڑا سیاسی لیڈر....برسراقتدار جماعت کا وزیر....اس سے رجوع ہو جائے۔ایک ہفتے میں قرض منظور ہو جائے گا۔''

میں خاموش رہا۔دروازے کے قریب ڈسٹ بین نظر آیا میں نے اپنی ذاتی فائل اسی ڈسٹ بین کے منھ پر دے ماری اور بینک کی عمارت سے باہر نکل آیا۔

☆☆☆

افسانہ

اسلم جمشید پوری

وطن واپسی

یونیورسٹی کے کھلے سبزہ زار میں وہ سب ایک گروہ کی شکل میں بیٹھے تھے۔ نیچے دور تک پھیلی ہری گھاس اور اوپر پیلی پیلی دھوپ گویا ہرے رنگ کے شلوار جمپر اور پیلا دوپٹہ اوڑھے کوئی حسینہ لیٹی ہوئی ہو۔

''یار، یہ کون ہیں۔'' موہن نے اکرم کی جانب سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے یہ میرے دوست، اصغر ہیں۔ دوبئی میں ایک کمپنی میں منیجر ہیں۔ آج ہی آئے تھے تو میں انہیں یونیورسٹی لے آیا..'' وہ تھوڑی دیر کو رکا اور پھر اصغر سے مخاطب ہوتے ہوئے اپنے دوستوں کا تعارف کرانے لگا۔

''اصغر یہ موہن ہے۔ ہندی میں پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔ یہ سیما ہے، سوری ڈاکٹر سیما ہے۔ ابھی ابھی تاریخ میں ڈاکٹر بنی ہیں اور یہ محسن ہے، ماس کام میں ایم اے پورا کیا ہے۔ ٹی وی کے پروگرام کرتا ہے.......اور میں، تمہیں خبر ہی ہے کہ اردو میں پی ایچ ڈی کر رہا ہوں....''

''او کے فرینڈز....اکرم میرا فاسٹ فرینڈ ہے۔ ویسے میرا تعلق امین آباد لکھنؤ سے ہے۔ میں نے ایم بی اے کیا ہے اور دو سال سے گلف میں ہوں....''

تعارف کا سلسلہ ختم ہوا۔ چار دوستوں کی ٹولی میں ایک اضافہ ہو گیا تھا۔

اصغر نے محسوس کیا تھا کہ سیما اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل کے تار میں ارتعاش سا ہوتھا۔ بات آئی گئی ہو گئی۔ اصغر اکثر یونیورسٹی آ جایا کرتا تھا کبھی اکرم کے ساتھ اور کبھی تنہا۔ سیما سے بات کرنے کی خواہش ایک دن اچانک خود بخود پو ری ہو جائے گی اس نے سوچا بھی نہیں تھا۔ ایک دن وہ منہ میں سگریٹ دبائے اپنی ہی دھن میں یونیورسٹی مین گیٹ سے اندر داخل ہو رہا تھا کہ ایک نقرئی آواز نے اس کے قدم تھام لیے۔

''اصغر صاحب، ہم بھی آ رہے ہیں....''

اصغر نے سیما کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ وہ پیلے رنگ کی ساڑی میں بے حد دیدہ زیب لگ رہی تھی۔ لمبا قد، دراز گیسو، نکھرا نکھرا رنگ، سیاہ چشمے..گویا قیامت سج دھج کر سب کچھ تباہ و بر باد کرنے نکلی ہو۔

''جی.......سیما جی.....آپ.....؟''

''ہاں...آیئے کافی لیتے ہیں___''

''چلیں''

دونوں کینٹین پہنچ گئے۔ کافی کا آرڈر دیا اور ادھر اُدھر کے نظاروں میں گم ہو گئے۔ یونیورسٹی میں چہل پہل بڑھ گئی تھی۔ فروری کے آخری دن تھے۔ موسم خوش گوار ہو گیا تھا۔ ٹھنڈ رخصت ہو رہی تھی، گرمی اپنا بستر بچھانے کی تیاری میں تھی۔ راستے، ہرے بھرے لانس، کینٹین سب لڑ کے لڑکیوں سے آباد تھے۔ بے شمار رنگوں کے پھریرے تھے جو اِدھر سے اُدھر اڑتے نظر آ رہے تھے۔ باتیں، قہقہے، موسیقی، شور شرابہ، ہارن کی آوازیں______ سمسٹر ایگزام ختم ہوئے تھے اور نئے سمسٹر سے پہلے کے دن تھے۔ یہ دن موج مستی کے ہوتے ہیں۔ پڑھاکو سے پڑھاکو طالب علم بھی تفریح کے موڈ میں ہوتا ہے۔ فلم، خوش گپیاں، تفریح، کرکٹ میچ وغیرہ میں دلچسپی بڑھ گئی تھی۔

''کافی.....'' بیرے کی آواز پر دونوں چونکے۔

''ارے اصغر صاحب آپ کہاں کھو گئے ہیں؟''

''بس یونہی یونیورسٹی کا نظارہ کر رہا تھا____ اپنا زمانہ یاد آ رہا تھا۔ کیا زمانہ ہوتا ہے؟''

''اصغر صاحب.....''

بھئی یہ صاحب واحب کا سلسلہ بہت ہو گیا۔ میں اصغر اور آپ سیما، بس اور کچھ نہیں ــــــ''

''او کے.......جی اصغر صاحب....سوری اصغر....مجھے آپ کی مدد چاہیئے۔''

''میں حاضر ہوں......آپ بتائیں''

''سنا ہے گلف میں بھی ٹیچنگ کی پوسٹیں آتی رہتی ہیں، مجھے بھی باہر جانا ہے۔ آپ مجھے گائڈ کریں.....''

''ہاں...سیما...آپ جیسی لڑکیوں کے لیے بہت اچھے چانس ہیں۔''

''میں واپس جا کر آپ کو مطلع کروں گا۔ آپ اپنے کاغذات وغیرہ تیار رکھو۔''

''واقعی آپ ایسا کریں گے۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا ہے۔'' سیما خوشی کے مارے کھلی جا رہی تھی۔

''سیما....جب آپ سے دوستانہ تعلق ہو گیا تو سمجھو سب کچھ میری ذمہ داری۔ ڈن....'' اصغر نے ہاتھ آگے بڑھایا۔

''ڈن''

کہتے ہوئے سیما نے بڑی گرم جوشی سے اصغر کا ہاتھ تھام لیا۔ وفور جذبات سے مغلوب دونوں کے ہاتھ ایک دوسرے میں یوں پیوست تھے گویا دو تھے ہی نہیں۔ دونوں کو ہاتھ چھڑانے کی جلدی نہیں تھی۔ ہوا کا ایک خوش گوار جھونکا دونوں کو چھو کر گذرا اور دونوں کو ایک لطیف احساس کرا گیا۔ بیرا آ گیا تھا۔ اصغر نے پاکٹ سے پیسے نکال کر دیئے اور دونوں اٹھ گئے۔

''اچھا سیما.....پھر ملتے ہیں؟''

''جی....آپ.......گلف واپس کب جا رہے ہیں؟''

''اس منتھ کے لاسٹ میں۔ بس پندرہ دن بچے ہیں اور کام بہت زیادہ ــــــ''

اور دونوں پھر ملنے کا وعدہ کر کے واپس ہو لیے۔

....

سیما ایک اوسط گھرانے سے تعلق رکھتی تھی۔ اس کے والد چودھری رتن لال کی لکھنؤ، لال باغ میں گاڑیوں کے پارٹس کی دکان تھی۔ وہ سنگھ وچار دھارا کے تھے اور لال باغ علاقے کے صدر بھی تھے۔ ان کے دو بچے سیما اور مدن تھے۔ سیما بڑی تھی اور مدن چھوٹا۔ مدن بی اے کر رہا تھا۔ سیما نے تاریخ میں پی ایچ ڈی کی تھی۔ وہ کسی یونیورسٹی میں خاص کر غیر ملکی یونیورسٹی میں جاب کی خواہش مند تھی لیکن وہ اپنی اس خواہش کو دل ہی دل میں رکھتی کہ اس کے پوری ہونے کی امید، نا کے برابر تھی۔ یعنی امید کے پوری ہونے کے درمیان 'نا' حائل تھا۔ مگر جب سے اس کی اصغر سے ملاقات ہوئی تھی، اسے 'نا' کے ہٹ جانے کی امید ہو چلی تھی۔ یوں بھی اصغر اسے پہلی نظر میں ہی بھا گیا تھا۔ کیا خوبرو نوجوان تھا۔ تقریباً چھ فٹ لمبا قد، گورا رنگ، چہرے پر ہلکی سیاہ داڑھی۔ وہ اصغر کو دل ہی دل میں پسند کرنے لگی تھی۔ پسند کرنے سے پہلے اس نے یہ بھی نہیں سوچا کہ اصغر اس کے مذہب کا نہیں ہے۔ ویسے پیار کرنے والے یہ باتیں سوچا بھی نہیں کرتے۔ سیما نے اصغر کو لے کر خیالی دنیا بھی بسانی شروع کر دی تھی۔ اگر اصغر کی مدد سے مجھے گلف کی کسی یونیورسٹی میں جاب مل جاتی ہے تو میں اور اصغر، اپنی دنیا الگ بسا لیں گے۔ مجھے جس طرح کے شہزادے کی تلاش تھی وہ اصغر ہی ہے۔ اپنے والد کو بھی سمجھا لوں گی۔ مان جائیں گے وہ۔ میں ان کی اکلوتی بیٹی ہوں۔ وہ سوچتے سوچتے اپنی سیماؤں سے باہر چلی گئی تھی۔

دوسری طرف اصغر کا حال بھی سیما جیسا ہی تھا۔ اصغر کو امید نہیں تھی کہ اسے سیما جیسی خوبصورت ٹال فگر لڑکی یوں اچانک دوست کی شکل میں ملے گی۔ اصغر ایک مذہبی گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ اس کے والد شہر کے معروف عالم تھے جن کی تقریر سننے لائق ہوتی تھی۔ بحیثیت مقرر ان کا کوئی ثانی نہیں تھا۔ گھر میں مذہبی ماحول تھا۔ تعلیم کے معاملے میں بھی ان کا گھر مثالی تھا۔ اصغر کے والد خود بھی اردو میں ایم اے، تھے۔ اصغر کی والدہ نے بی اے کیا

تھا۔اصغر نے ایم بی اے میں یونیورسٹی ٹاپ کیا تھا۔اس کے باوجود اصغر نے اپنے گھر کی روایتوں کو نہیں چھوڑا۔ایم بی اے کرنے کے کچھ ماہ بعد ہی اسے گلف میں ایک بڑی کمپنی میں ملازمت مل گئی تھی۔گھر میں نئی روشنی کا استقبال بھی تھا اور اپنی تہذیب وروایت کی پاسداری بھی۔وہ جب کبھی چھٹیوں میں آتا تو اکرم کے ساتھ گھو منے پھرنے کا پروگرام بنالیتا۔لکھنؤ کے تقریباً سبھی مقامات وہ گھوم چکے تھے۔پہاڑوں کی بھی خوب سیر ہو چکی تھی۔اکرم اکثر اسے یو نیورسٹی چلنے کو کہتا مگر وہ ہمیشہ ٹال جاتا تھا۔

''یار وہاں میں کیا کروں گا۔وہاں تمہارے دوست ہوں گے...میں ان سے کیا بات کروں گا۔''

لیکن اس بار اکرم اسے یونیورسٹی لے ہی آیا اور اپنے دوستوں سے ملاقات کرائی۔اصغر کو یونیورسٹی کا ماحول بہت اچھا لگا۔وہ اب اکرم کے ساتھ اور کبھی خود بھی ادھر آنکلتا۔سیما سے جان پہچان، ملاقات، دوستی جب مزید شدت اختیار کرنے لگی تو بے چینی اور اضطراب بڑھنے لگا۔اب اکثر وہ دونوں ساتھ ہوتے۔کبھی بھول بھلیاں میں گم ہوتے اور کبھی ایک دوسرے کو اچانک چھو لیتے۔بارہ دری کے لان، کافی ہاؤس کی کرسی میزیں، حسین آباد کے کیفے، سہارا مال، فن مال، گومتی نگر...سب ان کی موجودگی درج کر چکے تھے۔وہ دونوں خود بھی ایک دوسرے کے دل سمندر میں کافی اندر تک اتر چکے تھے۔سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔دونوں قربت کی سڑک پر مخالف سمتوں سے آگے بڑھ رہے تھے کہ اچانک اصغر کے واپس جانے کا دن قریب آگیا۔ویسے یہ اچانک تو نہیں تھا مگر دونوں، ایک دوسرے میں ایسے گم تھے کہ انہیں یہ احساس ہی نہیں تھا کہ ہر وصال کو ہجر ہے۔

'' ارے سیما......یار مجھے پرسوں واپس جانا ہے......''اصغر نے سیما کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیتے ہوئے کہا۔

''اصغر.....تم اتنی جلدی کیوں جا رہے ہو...ٹکٹ آگے بڑھوا لو نا.......میں تمہارے بغیر کیسے رہوں گی۔''

'' جان...کمپنی اور چھٹی نہیں دے رہی۔ میں نے Try کیا تھا۔مجبوری ہے ورنہ کون کافر ہوگا جو تم سے دور رہ کر سکون سے رہ پائے۔''

''اب باتیں نہ بناؤ.......میری جاب کا خیال رکھنا، میں کل تمہیں اپنے کاغذات دے دوں گی۔گلف کی کسی بھی یو نیورسٹی میں....پھر ہم دونوں ہمیشہ کے لیے ایک ہو جائیں گے۔''

اصغر کبھی سیما کے جذبات اور اپنی محبت کے بارے میں سوچتا اور کبھی اپنے گھر والوں کے بارے میں۔غیر مذہب میں شادی کے لیے اس کے والدین کبھی تیار نہ ہوں گے۔سیما کو لے کر وہ عجیب ادھیڑ بن میں تھا۔ویسے سیما ہر طرح سے ایک اچھی بیوی بننے لائق تھی۔اسے یہ بھی یقین تھا کہ اگر وہ سیما کے سامنے مذہب تبدیل کرنے کی بات رکھے گا تو وہ بھی مان لے گی۔لیکن اسے اپنے والد سے بات کرنے میں ایک طرح کا ڈر محسوس ہوتا تھا۔پھر بھی اس نے سوچا یہ بعد میں دیکھا جائے گا۔وہ جب سے سیما کے قریب آیا تھا، اس کے ذہن میں ایک نئی دنیا آباد ہو رہی تھی۔

....

اصغر کو دبئی آئے کئی دن ہو گئے تھے۔اس کا دل کام میں نہیں لگ رہا تھا۔بلکہ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اس کا دل تو لکھنوء میں چھوٹ گیا ہو۔اس نے آتے ہی سیما کے لیے کام کی تلاش شروع کر دی تھی۔سردست ایک اسکول میں جگہ مل گئی تھی۔اس نے سیما کے کاغذات جمع کرا دیے تھے۔اسکول والوں نے سیما کا لکھنؤ میں ہی انٹرویو کرایا، سیما پاس ہو گئی تھی اور دو مہینے کے اندر سیما، اپنے ملک کی سیماؤں سے پرے، اپنے دوست، کی دنیا میں داخل ہو چکی تھی۔سیما نے اسکول جوائن کر لیا تھا۔کچھ دن بعد دونوں ایک مال میں ملے تھے۔

''سیما...''اصغر خوشی سے بے قابو ہو رہا تھا۔

''جی.....اصغر'' دونوں مضطرب روحوں کی طرح ملے تھے۔بھرے پرے مال میں گلے نہیں مل سکتے تھے۔ہاتھ ضرور ایک

دوسرے سے گلے مل رہے تھے۔

''سیما مبارک باد!......ہندوستان کے بعد آج مل رہے ہیں۔اب آگے کیا کرنا ہے؟''

''اصغر..... مجھے کچھ نہیں کرنا، جو کرنا ہے وہ تمہیں ہی کرنا ہے۔''

''چلو شادی کر لیتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے...''

''پر تمہیں اسلام میں داخل ہونا ہوگا۔ میں چاہتا ہوں کہ بنا کسی دباؤ کے تم اسلام قبول کرو۔ ویسے جو تم چاہو...''

''اصغر مجھے تمہارے نام کے meaning پتہ ہیں (تم نے ایک بار بتایا تھا) تم صرف نام کے اصغر ہو۔ تمہارا دل بہت بڑا ہے۔ میں چاہوں تو سیما رہتے ہوئے بھی، ہم شادی کر سکتے ہیں۔ لیکن مجھے تم اور تمہارا مذہب پسند ہے۔ میں اپنی مرضی سے اسلام قبول کرتی ہوں۔''

دو چار دن کی خانہ پُری کے بعد سیما سے ثنا بنی دلہن اپنے مجازی خدا اصغر کے یہاں آ گئی تھی۔ دو مذہب ہی ایک نہیں ہوئے تھے بلکہ ایسا لگ رہا تھا گویا زمین و آسمان کا ملن ہوا ہو۔ دو انسانوں کے اس ملن پر قدرت بھی مہربان تھی۔ برسوں بعد دبئی کے آسمان پر کالے کالے بادل نظر آئے اور اتنے ٹوٹ کے برسے کہ سب کچھ جل تھل کر دیا۔ پیاسی روحوں کو قرار آ گیا تھا۔

دونوں نے اپنے اپنے گھر خبر کر دی تھی کہ انہوں نے شادی کر لی ہے۔ لکھنؤ میں تیز ہواؤں کے ساتھ زبردست طوفان آیا تھا۔ درخت، بجلی کے کھمبے، اشتہارات کے ہورڈنگس، ٹین کے چھپر سب اپنی جگہ چھوڑ رہے تھے۔ ایسا طوفان کہ جانے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ سب کچھ خاکستر کرنے پر تلا تھا۔

سیاسی اعتبار سے بھی لکھنؤ کی سرزمین طوفان سے ہم آہنگ ہوئی تھی۔ سنگھ کی حمایت والی پارٹی اقتدار میں آ گئی تھی۔ مسلمانوں کی حمایتی پارٹی کی بری طرح شکست ہوئی تھی۔ لال اور ہرے رنگ پر زعفرانی رنگ نے بازی مار لی تھی۔ پورے ملک میں زعفرانی جھنڈے لہرا رہے تھے۔ لکھنؤ زعفرانی رنگ کی کثافت کی سب سے بڑی شناخت بن کر ابھرا تھا۔ کیا شہر، کیا قصبہ اور دیہات ہر جگہ زعفرانی رنگ کے جلوے تھے۔ پورے صوبے کا ماحول تیزی سے تبدیل ہو رہا تھا۔ عجیب و غریب قسم کے نعروں کی گونج سنائی دے رہی تھی۔

''بھارت میں رہنا ہے تو ہندو بن کر رہنا ہوگا۔''

''ایک ملک، ایک دھرم...''

''دیش ایک، قانون ایک......''

''لو جہاد نہیں اب۔ گھر واپس ہوں سب۔''

شہر کا ماحول خراب کرنے کی بھی کوششیں کی جا رہی تھیں۔ مسلمان لڑکوں کے ساتھ ہندو لڑکی دکھائی دے جاتی تو بس سمجھو کہ آفت آ گئی۔ کہیں پتہ چلتا کہ کسی مسلم لڑکے نے ہندو لڑکی سے شادی کر رکھی ہے تو لڑکے لڑکی دونوں کو زد و کوب کیا جاتا۔ شادی ختم کرا کر لڑکی کو اس کے گھر بھیج دیتے۔ اس کے برعکس اقلیتوں کی لڑکیاں اور عورتیں محفوظ نہیں تھیں۔ کہیں نقاب میں کوئی عورت نظر آ جاتی تو اسے پریشان کرنا عام سی بات ہو گئی تھی۔ سنگھ کے بڑے لیڈران اپنی آبادی بڑھانے کے لیے اپنی قوم کو اکسا رہے تھے۔

''ہم دو، ہمارے پانچ ____''

سوامی آنند اپنی زہریلی تقریر میں مسلمانوں کو برا بھلا کہتے اور ہندوؤں کو اپنی تعداد بڑھانے کے لیے حوصلہ دیتے۔

''دیکھو بھائیو۔ ہم ہندوؤں کی تعداد اگر اسی طرح کم ہوتی رہی تو ہم اکثریت سے اقلیت میں بھی آ سکتے ہیں۔ اس لیے کچھ بھی کرو، زیادہ سے زیادہ اولادیں پیدا کرو۔''

کچھ سنگھ والوں کی یہی ڈیوٹی تھی کہ وہ پتہ لگائیں کہ کس ہندو لڑکی نے مسلم لڑکے سے شادی کی ہے۔ کون کب مسلمان ہوا ہے اور کوشش کر کے ان کی گھر واپسی کرائی جائے۔ اس کے لیے جو بھی کرنا پڑے، کریں۔ ایسے ہی ایک ورکر کو خفیہ ذرائع سے علم ہو گیا

کہ پارٹی کے پرانے ورکر رتن لال کی بیٹی نے کئی سال قبل گلف میں اپنے مسلم دوست سے شادی کر لی ہے۔ بس پھر کیا تھا۔ رتن لال کے گھر فون کی گھنٹیاں بجنے لگیں۔ پارٹی کے بڑے چھوٹے لیڈران کی آمد بڑھ گئی۔ رتن لال عجیب کشمکش میں تھے۔ ایک طرف جگر کا ٹکڑا تھا تو دوسری طرف پارٹی۔ ایک بڑے لیڈر سے خفیہ میٹنگ میں کچھ باتیں طے ہوگئیں۔

سیما، اپنے والد کے فون پر حیران بھی تھی اور خوش بھی کہ ان کی شادی کی خبر کے کئی سال بعد اس کے والد کا فون آیا تھا۔ وہ تو مایوس ہو چکی تھی کہ اب وہ اپنے والدین اور بھائی سے کبھی نہیں مل پائے گی۔ اس کی شادی کو پانچ سال کا عرصہ گذر چکا تھا۔ اس دوران وہ ایک پیارے سے بیٹے احمر کی ماں بن چکی تھی۔ اس کے والد نے فون پر بڑی جذباتی باتیں کی تھیں۔

''سیما.......بیٹی''

''جی پاپا........'' آنسو سیما کی آنکھوں کی حدوں میں قید نہ رہ سکے۔

''بیٹے تمہیں اپنے باپ، ماں اور بھائی کی یاد نہیں آتی۔ تم کتنی پتھر دل ہوگئی ہو۔'' اُدھر آواز رندھ رہی تھی۔

''نہیں پاپا... مجھے لگا آپ لوگ مجھے معاف نہیں کرو گے۔ پاپا میں تو آج بھی آپ لوگوں کے لیے تڑپتی ہوں........'' وہ رو پڑی۔ سسکیاں دوسری طرف بھی پہنچ رہی تھیں۔

''تو آ جاؤ نا.....چھٹی لے لو۔ ایک دو مہینے کے لیے آ جاؤ......ہم سب تمہیں مس کر رہے ہیں؟''

''وہ پاپا..ابھی آنے میں وقت ہے۔ وہ ،اصغر کو چھٹی نہیں مل سکتی۔ انہیں دو مہینے کے لئے امریکہ جانا ہے.....''

''بیٹا پھر تو بہت اچھا ہے۔ تم اتنے دنوں کے لیے ادھر آ جاؤ...'' فون، سیما کی ماں نے لے لیا تھا۔

''سیما بیٹے!.......'' وہ روتے روتے بول رہی تھیں۔

کچھ دیر خاموشی بنی رہی۔ ایسا محسوس ہو رہا تھا گویا اب خاموشی کو گویائی مل گئی ہو۔

''جی.......ماں....'' آنسو رک نہیں پا رہے تھے۔

''اچھا ماں میں آ رہی ہوں....'' اس نے ماں اور باپ کے آنسوؤں کو مایوس نہیں کیا اور طے کیا کہ وہ لکھنؤ ہو آئے گی۔

اس نے اصغر سے بات کی۔ اصغر نے کہا۔

''ثنا، دیکھ لو.....میں تمہیں منع نہیں کروں گا....مگر احمر کا خیال رکھنا...وہ میرے جگر کا ٹکڑا ہے...اور ہاں ہمارے گھر بھی ہو لینا۔ میں ابو سے بات کر لوں گا۔ ویسے وہ ناراض تو ہیں لیکن میں سمجھا دوں گا۔ تمہیں پتہ ہے میری امی سے کبھی کبھار بات ہو جاتی ہے۔''

''ٹھیک ہے اصغر تم ہم دونوں ماں بیٹوں کے ٹکٹ کرا دو۔''

کچھ دن بعد وقت مقررہ پر سیما جو اب ثنا اصغر بن چکی تھی۔ اپنے بیٹے احمر کے ساتھ اپنے شہر، اپنے وطن یعنی لکھنؤ کے اموسی ایئر پورٹ پر پہنچ گئی تھی۔ ایئر پورٹ پر توقع سے زیادہ بھیڑ تھی۔ لگ رہا تھا کوئی سیاسی لیڈر آنے والے ہیں۔ سیما کا بھائی ایئر پورٹ آیا ہوا تھا۔ سیما اس سے مل کر بہت روئی۔ گھر پہنچ کر سیما کا پرتپاک استقبال ہوا۔ اس کے والد، والدہ بھی مل کر خوب روئے۔ برسوں بعد آنسوؤں کے باندھ، کھلے تھے۔

دو تین دن گھر پر سکون سے گذرے۔ ایسا سکون، جس کے لیے وہ برسوں سے تڑپ رہی تھی۔ تین سالہ احمر دو تین دن میں ہی اپنے ماموں اور نانا۔ نانی کو جاننے اور پکارنے لگا تھا۔

دو تین دن بعد اس نے جب اصغر کے گھر جانے کی بات کہی تو اس کے والد کا رخ بدل گیا۔

''سیما.....تم وہاں نہیں جاؤ گی...''

''کیوں پاپا......وہ میری سسرال ہے۔''

''ہوگی.....ہمارے لیے تم کنواری سیما ہو، بس...آج سے تمہارا اصغر اور اس کے گھر والوں سے رشتہ ختم...اور ہاں سن لو.....خاموشی سے گھر میں رہو.....مجھے مجبور نہ کرنا کہ میں کوئی غلط قدم اٹھاؤں، کسی کو فون نہیں کرو گی.'' پھر وہ بیٹے کی طرف گھومے....

''اور تم اس کے موبائل اپنے قبضے میں کرلو۔سم نکال کر توڑ دو۔دھیان رکھو۔گھر سے باہر نہ جائے...''

پھر انہوں نے بیٹے کے کان میں سرگوشی کی۔

''سیما کے کاٹو تو خون نہیں۔وہ بری طرح جال میں پھنس گئی تھی۔اس نے ایسا کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔وہ اصغر کو کیا جواب دے گی۔اس نے احمر کو اپنی چھاتی سے لپٹا لیا تھا۔اسی ادھیڑ بن میں نہ جانے رات کے کس پہر اس کی آنکھ لگ گئی۔اس نے خواب میں دیکھا، اس کا احمر لہولہان ہو رہا ہے۔کسی نے اسے چاقو مارا ہے۔معصوم احمر کی چیخیں گونج رہی ہیں۔وہ مدد کو پکار رہی ہے ---وہ اچانک گھبرا کر اٹھ گئی۔اس نے اپنے پاس سو رہے احمر کو مضبوطی سے خود سے بھینچ لیا۔سارا گھر سو رہا تھا۔سیما کا دماغ جاگ رہا تھا۔وہ اٹھی اپنی ضروری چیزیں سمیٹیں اور آہستہ سے احمر کو گود میں لے کر گھر سے باہر آ گئی۔باہر آتے ہی اس نے ایک سمت کو دوڑنا شروع کر دیا۔ہر آہٹ اس کے دل کی دھڑکنیں بڑھا دیتی۔کچھ دوری پر اسے ایک آٹو رکشہ نظر آیا اس نے پوچھا۔

''امین آباد چلو گے...''

''جی میڈم.....''

اور وہ انتہائی پھرتی سے آٹو میں بیٹھ گئی۔''بھیا ذرا جلدی چلاؤ.....''

دہشت اور خوف اس کے دل و دماغ پر طاری تھا۔وہ جلد سے جلد اصغر کے گھر پہنچ کر احمر کو محفوظ کرنا چاہتی تھی۔اس نے اصغر کا گھر تو نہیں دیکھا تھا مگر اسے علاقہ پتہ تھا۔پھر اصغر کے والد بہت معروف تھے۔وہ پتہ لگا لے گی۔وہ کسی بھی طرح احمر کو دنیا سے بچانا چاہتی تھی۔وہ اپنے گھر والوں سے بہت ڈر گئی تھی۔اس نے آٹو امین آباد چوک پر چھوڑ دیا تھا۔رات کے تین بج رہے تھے۔ہر طرف سناٹا چھایا ہوا تھا جسے آوارہ کتے کبھی کبھار توڑنے کی کوشش کرتے اور پھر خاموش ہو جاتے۔آدھے گھنٹے کی بھاگ دوڑ اور پوچھ تاچھ کے بعد اسے اصغر کے والد کا گھر مل گیا تھا۔اس نے ڈرتے دل سے ہمت کر کے بیل بجائی۔تھوڑے انتظار کے بعد دروازہ کھلا...ایک ادھیڑ عورت کی آواز آئی۔

''کون ہے...اتنی رات میں...کیا کام ہے؟''

سیما سمجھ گئی تھی کہ یہ اصغر کی والدہ ہیں۔

''امی...میں...آپ کی بہو....''

''کون ثنا......ارے اتنی رات کو....آؤ....آؤ بیٹا'' وہ ثنا کو اپنے کمرے میں لے گئیں۔وہ جہاں دیدہ عورت تھیں۔انہیں اچھی طرح علم تھا کہ اصغر کے ابو، اصغر کی شادی سے راضی نہیں ہیں۔ٹھیک ہے سیما نے اسلام قبول کرلیا تھا مگر وہ بہت ناراض تھے۔لہٰذا وہ ثنا کو لے کر اپنے کمرے میں آ گئیں جہاں کوئی نہیں تھا۔اصغر کے ابو اپنے کمرے میں محوِ خواب تھے۔

رتن لال صبح اٹھے تو انہیں گھر کا صدر دروازہ کھلا ہوا نظر آیا۔وہ فوراً سیما کے کمرے میں لپکے مگر وہاں خالی پلنگ انہیں منہ چڑا رہا تھا۔ان کے غصے کی انتہا نہ رہی۔پل بھر میں ہی گھر جاگ گیا تھا۔گھر کی بات پڑوس میں بھی پھیل چکی تھی۔فون کھنکنے لگے۔آدھا پون گھنٹے میں ہی پچاسوں نوجوان، لاٹھی ڈنڈے اور دوسرے ہتھیار لیے جمع ہو گئے تھے۔رتن لال کو سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ سیما کہاں ہوگی۔سارا پلان بن چکا تھا۔گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں پر سوار قافلہ۔امین آباد چوک پر پہنچ چکا تھا۔

''جے شری رام۔۔جے شری رام''

''لو جہاد نہیں چلے گا...'' نعروں کی گونج کے بیچ خون کے پیاسے لوگوں نے اصغر کا گھر گھیر لیا تھا۔

’’نکالو....سیما..کونکالو......‘‘

دروازے پیٹے گئے اور لمحہ بھر ہی میں پتھر برسنے لگے۔

محلے والوں کو کچھ بھی خبر نہیں تھی۔اچانک ہونے والے حملے سے وہ بوکھلا گئے تھے۔انہیں یہ سمجھتے دیر نہیں لگی کہ شاید اصغراور سیما آ گئے ہیں۔کچھ محلے والوں نے بھی جوابی کارروائی شروع کردی۔باہرایک عجیب عالم تھااور گھر کے اندر....

اصغر کے والد بہت ناراض ہو رہے تھے۔وہ سیما پر لال پیلے ہو رہے تھے۔

’’تم نے یہاں آ کر اچھا نہیں کیا۔خدا کے لیے اب تم جاؤ.......‘‘

’’ارے آپ ایسے کیسے بہو کو ان ظالموں کے حوالے کر سکتے ہیں۔یہ لوگ اسے مار ڈالیں گے۔‘‘اصغر کی والدہ نے بہو کی حمایت کی۔

’’وہ تمہیں اور مجھے بھی مار ڈالیں گے۔وہ ہتھیاروں سے لیس ہیں۔ان کے سر پر خون سوار ہے۔‘‘

’’امی مجھے جانے دیں۔آپ احمر کو رکھ لیں۔اسے بچا لینا‘‘۔یہ کہتے ہوئے سیما نے اپنی آنسوؤں سے تر آنکھوں کے درمیان بیٹے کو چوما،آنسو کے قطرے چہرے سے نیچے پہنچ رہے تھے۔ اس نے ایک بار احمر کو اپنے سینے سے لگایا اور پھرتی سے دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔جو ہو گا دیکھا جائے گا۔

باہر کھڑے دنگا کر رہے لڑکوں نے اسے پکڑ لیا۔کچھ اندر گھسنے کی کوشش کرنے لگے مگر اندر سے دروازہ بند کیا جا چکا تھا۔لڑکے سیما کو کھینچتے ہوئے ایک طرف لائے۔رتن لال کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا۔اس سے قبل کہ وہ کوئی قدم اٹھاتے،کسی نے سیما کے پیٹ میں چاقو گھونپ دیا،سیما کی چیخیں بلند ہو رہی تھیں اور خون بہہ رہا تھا۔آس پاس کے لوگ اپنے گھروں میں دبک گئے تھے ۔اتنے میں کسی نے اصغر کے گھر کو آگ کے حوالے کر دیا۔آگ نے اپنا کام شروع کر دیا تھا۔دیکھتے ہی دیکھتے آگ کے شعلے کافی بلند ہو گئے تھے۔اندر سے چیخنے چلانے کی آوازیں آ رہی تھیں۔

’’احمر.......احمر....‘‘

چیختی ہوئی ادھ مری سیما جلتے ہوئے گھر میں گھسنا چاہ رہی تھی،اچانک وہ گر پڑی اور روح جسم کی سیماؤں سے نکل گئی۔

پولس کے سائرن سے کچھ لوگ بھاگ کھڑے ہوئے تھے۔آگ بجھانے والی گاڑیاں آ گئی تھیں۔اصغر کا گھر بری طرح جل گیا تھا۔اب بھی شعلے لپک رہے تھے۔پولس اور آگ بجھانے والوں نے گھر کے اندر گھس کر اپنا کام شروع کر دیا تھا۔اصغر کی والدہ اور والد جل کر دم توڑ چکے تھے۔ننھا اصغر ڈرا سہا سا گھر کے ایک کونے میں دبکا کھڑا تھا۔آگ وہاں پہنچنے سے پہلے بجھ چکی تھی۔احمر بدحواس سا کھڑا تھا اس کے کپڑے کہیں کہیں سے جل گئے تھے۔ایک پولس والا اسے اپنی گود میں اٹھا کر باہر لے آیا۔باہر خون کی پیاسی نظریں،ہاتھوں میں چمچماتے ہتھیار بے قابو ہو رہے تھے۔

باہر آتے ہی احمر کی نظر کچھ دوری پر کھڑے رتن لال پر پڑی۔وہ پولس والے کی گود سے اتر کر،ان کی طرف دوڑا۔

’’نانو.....مجھے بچا لو۔۔ نا۔۔ن۔۔و۔۔و‘‘

لفظ اس کے حلق میں دم توڑ رہے تھے۔

احمر رتن لال کی ٹانگوں میں گھسا جا رہا تھا اور رتن لال کی آنکھوں کا خون،پانی بن کر باہر آنے لگا تھا۔

سب رس انٹرنیٹ پر

Sherosokhan.net پر پہلے صفحے پر اوپری جانب انگریزی سرخیوں میں’’برقی کتب‘‘ کے عنوان پر کلک کرنے پر’’سب رس‘ کے شمارے پڑھے جا سکتے ہیں۔صفحہ اول پر ہی ایک نشان’’سب رس‘‘ کا ہے اس پر کلک کر کے تازہ شمارہ پڑھا جا سکتا ہے۔

شاعری

غزلیں

راشدانورراشد

سب کو انجان بنا دیکھ رہا تھا وہ بھی
غالبًا شہر مہذب میں نیا تھا وہ بھی

اشک ابھرے تھے ندامت کے مری آنکھوں میں
بھول پہ اپنی پشیمان ہوا تھا وہ بھی

غیر کی بستی سے اک سنگ ملامت آیا
اجنبی لوگوں کے ہمراہ کھڑا تھا وہ بھی

میں نے جاتے ہوئے دیکھا تھا پلٹ کر اس کو
آگے بڑھتے ہوئے اک پل کو رکا تھا وہ بھی

ٹوٹ جائے گا، مگر جھک نہیں سکتا یہ شجر
دیکھ کر برگ و ثمر جان گیا تھا وہ بھی

ساتھ رہتے تھے تو معمول پہ سب کچھ تھا مگر
بعد میں علم ہوا ایک نشہ تھا وہ بھی

آخری بار مری آنکھوں کو جل تھل کر دے
میں ادھورا ہوں مجھے آ کے مکمل کر دے

ہوش میں رہ کے بھی کب آیا ہے جینا مجھ کو
اب تو بے حس ہی بنا دے، مجھے پاگل کر دے

ہر پہاڑی پہ سرِ شام نہ برسا مجھ کو
مجھ سے کچھ کام لے کے صحراؤں کا بادل کر دے

درمیاں سے تو کوئی راہ نکلتی ہی نہیں
میں تو تھک ہار گیا، تو اسے قایل کر دے

دیکھی جاتی نہیں بد حالی زمینِ دل کی
یا تو گلزار بنا یا اسے جنگل کر دے

شاعری

غزلیں

نبیل احمد نبیل

جہاں کی رسم سے، اِک رابطے سے آئی ہے / تمھاری یاد عجب زاویے سے آئی ہے

وگرنہ زیست کی خواہش نہ تھی ذرا مجھ میں / یہ آرزو تو تجھے دیکھنے سے آئی ہے

چمک اُٹھا ہے مرا چہرہ آفتاب کی مثل / یہ کیسی روشنی سی آئنے سے آئی ہے

بَلا کے حبس میں تازہ ہَوا مرے گھر میں / کہ جب بھی آئی ترے راستے سے آئی ہے

عجیب روشنی پھیلی مرے عزائم سے / عجب مہک سی مرے حوصلے سے آئی ہے

وہ قافیہ جسے نسبت تمھارے نام سے تھی / غزل میں تازگی اُس قافیے سے آئی ہے

مرے مزاج میں نرمی خنک ہَوا کی طرح / مری ہی عمر کے اِک سلسلے سے آئی ہے

بدل ہی ڈالے گی مرکز کا جبریہ دستور / یہ لہر اُٹھتی ہوئی حاشیے سے آئی ہے

تمام عمر غموں سے رہی ہے جنگ مری / کوئی خوشی بھی کہاں ضابطے سے آئی ہے

میں دیکھتا ہوں جو دنیا کو فہم سے اپنی / یہ فہم مجھ میں کسی زاویے سے آئی ہے

سو، یوں کہ مجھ میں ہی روشن کوئی چراغ سا تھا / سو، روشنی بھی اُسی مرحلے سے آئی ہے

مرے مکان کے روزن میں آنکھ رکھی تھی / یہ کچھ نمی سی اُسی زاویے سے آئی ہے

شجر تو سارے ہی کٹتے گئے تھے مرحلہ وار / نہ جانے فاختہ کس مرحلے سے آئی ہے

وہ ایک ولولہ جو تھا چراغ کی صورت / نویدِ صبح اُسی ولولے سے آئی ہے

نکل پڑا تھا جو گھر سے بغیر راہ نما / کوئی صدا بھی اُسی قافلے سے آئی ہے

نبیل ملتی ہے جو قیس کے قبیلے سے / وفا بھی مجھ میں اُسی سلسلے سے آئی ہے

یہ آج مجھ میں بصیرت نبیل ہے جتنی / شعور ہی کے کسی مرحلے سے آئی ہے

شاعری

نثری نظمیں

علیم صبانویدی

وہ
ہر رونے والے کو دیکھ رہا ہے
اور
ہر رونے والے کے آنسوؤں میں
چھپی داستانوں کو پڑھ رہا ہے
اس کے سوا
کر بھی کیا سکتا ہے
اس کا مردہ جسم

☆

تو لاکھ ہمیں
عقل کی روشنی دے
ہم تجھے
گماں کی نظر سے ہی
دیکھیں گے

☆

جو نام
کسی معنی کی طرف
اشارہ نہ کرے
وہ نام میرا ہے

اس کی ایک مسکراہٹ کے بعد
کئی سال
خموش گذر گئے
اب میں ہنسنا چاہتا ہوں
کوئی ایسی بات سنادو مجھے
جواَن سنی ہو

☆

میں اچھا آدمی نہیں
میری برتری بھی قبول مت کرو
میں بگڑے ہوئے راستے
درست نہیں کرتا

☆

تم کاغذ پر
براؤن شوگر رکھ کر
محبت کے موتی پروتی رہو
میں اپنا دفتر سر پر لے کر
رات بھر جاگتا رہوں گا

تم مجھے
انعام عطا کروگے تو
یہ تمہارا فضل ہے
تم مجھے
عذاب میں مبتلا کروگے تو میں
اسے تمہارا عدل سمجھوں گا

☆

میری کتاب
حاسدوں کی بدگوئی نہیں
ایک روشن
باب السّما ہے
تہذیب کا پہلا زینہ

☆

تیرے شہر میں
ہمدردی ملے گی
میرے جنگل میں انصاف
وقت ہے اب بھی
نکل آ
تیرے سب ساتھی
مادرزاد اندھے ہیں

شاعری

غزلیں

خالداقبال یاسر

دربار میں جب عرضِ ہنر اور طرح کی
سلطاں نے مرے فن کی قدر اور طرح کی

دیکھا جو زمانے نے مجھے ترچھی نظر سے
میں نے بھی زمانے پہ نظر اور طرح کی

ملتا ہی نہ تھا کوئی مجھے ایک طرح کا
میں نے بھی تو عمر اپنی بسر اور طرح کی

شاہاں نے بہت راہ پہ لانا مجھے چاہا
میری بھی طبیعت تھی مگر اور طرح کی

منزل جو مری دوسرے لوگوں سے الگ تھی
ایسے ہی نہ تھی میری ڈگر اور طرح کی

لفظوں سے سدا کام لیا میں نے زرہ کا
تلوار مری اور سپر اور طرح کی

کچھ اور تھے یاسرؔ مرے پیغام کے تیور
آئی تھی ادھر سے بھی خبر اور طرح کی

داستاں کے رخ نما ابواب چوری ہو گئے
لٹ گئے اوقاف سب اعراب چوری ہو گئے

بے غرض جاں نذر کرنے کی روایت پٹ چکی
عشق کے دربار کے آداب چوری ہو گئے

گرہ میں تھے کچھ نتیجے کچھ ادھورے تجربے
علّتیں غارت ہوئیں اسباب چوری ہو گئے

بھاپ بن کر اڑ گئے یا ہو گئے گم ریت میں
بند باندھے رہ گئے دریاب چوری ہوگئے

کرنی بھرنی اک طرف کیسا حساب و احتساب
سارے انکار اور سب ایجاب چوری ہوگئے

ہم عناں کے ذہنی اضمحلال کا کیا پوچھنا
میرے اپنے آہنی اعصاب چوری ہو گئے

مرحلہ خود آشنائی کا ابھی آیا نہ تھا
نام یاسرؔ مٹ گئے القاب چوری ہو گئے

شاعری

غزلیں

سلیم انصاری

برہنہ شاخوں پہ کب فاختائیں آتی ہیں
میں وہ شجر ہوں کہ جس میں بلائیں آتی ہیں

یہ کون میرے لہو میں دیئے جلاتا ہے
بدن سے چھن کے یہ کیسی شعائیں آتی ہیں

مجھے سند کی ضرورت نہیں ہے ناقد سے
مری غزل پہ حسینوں کی رائیں آتی ہیں

خدا سے جن کا تعلق نہیں بچا کوئی
سفر میں یاد نہیں بھی دعائیں آتی ہیں

انہیں خبر ہی نہیں کب کا بجھ چکا ہوں میں
مری تلاش میں اب تک ہوائیں آتی ہیں

میں چیختا ہوں کسی دشتِ بے اماں میں سلیم
پھر اس کے بعد مسلسل صدائیں آتی ہیں

مری انا کا اثاثہ ضرور خاک ہوا
مگر خوشی ہے کہ تیرے حضور خاک ہوا

مجھے بدن کے بکھرنے کا غم نہیں لیکن
ملال یہ ہے دلِ نا صبور خاک ہوا

میں اپنی خاک سے روشن ہوا جو صورتِ مشک
تمام موسمِ گل کا غرور خاک ہوا

بچھڑ کے تجھ سے یہ کم تو نہیں زیاں میرا
ہر ایک منظرِ نزدیک و دور خاک ہوا

میں حرف حرف تو روشن کیا گیا لیکن
لکھا ہوا تھا جو بین السطور خاک ہوا

یہ کیسا قحط مرے ذہن و دل پہ آیا ہے
سلیم میری غزل کا شعور خا ک ہوا

غزلیں

محمد علی منظر

شہر کی اس بھیڑ میں ہوں بے نشاں ہوتے ہوئے
دیکھتا رہتا ہوں خود کو رائیگاں ہوتے ہوئے

میری اس تنہائی کی اب کوئی تو تاویل ہو
کیوں اکیلا چل رہا ہوں کارواں ہوتے ہوئے

میں تمھارے گھر میں اک دن روشنی لے آؤں گا
اک ستارے نے کہا یہ مہرباں ہوتے ہوئے

ہر طرف مرجھائی کلیاں، ہر طرف پتوں کا شور
باغ کیوں اجڑا ہوا ہے باغباں ہوتے ہوئے

کب بھلا فرصت ملے گی فکرِ دنیا سے مجھے
گیت کب لکھوں گا منظؔر، شادماں ہوتے ہوئے

مثالی دنیا میں جی رہا ہوں
خیالی دنیا میں جی رہا ہوں
تمام چہروں پہ تیرگی ہے
میں کالی دنیا میں جی رہا ہوں
زبان شعلے اگل رہی ہے
جلالی دنیا میں جی رہا ہوں
تمام منظر بدل چکے ہیں
میں خالی دنیا میں جی رہا ہوں
میں اپنے خوابوں کے گل سجائے
نرالی دنیا میں نے جی رہا ہوں
ہر اک کاسہ بدست، منظؔر
سوالی دنیا میں جی رہا ہوں

شاعری

غزلیں

سالم سلیم

ہر ایک سانس کے پیچھے کوئی بلا ہی نہ ہو
میں جی رہا ہوں تو جینا مری سزا ہی نہ ہو

جو ابتدا ہے کسی انتہا میں ضم تو نہیں
جو انتہا ہے کہیں وہ بھی ابتدا ہی نہ ہو

مری صدائیں مجھی میں پلٹ کے آتی ہیں
وہ میرے گنبد بے در میں گونجتا ہی نہ ہو

بجھا رکھے ہیں یہ کس نے سبھی چراغ ہوس
ذرا سا جھانک کے دیکھیں کہیں ہوا ہی نہ ہو

عجب نہیں کہ ہو اس آستاں پہ جم غفیر
اور اس کو میرے سوا کوئی دیکھتا ہی نہ ہو

وہ ڈھونڈ ڈھونڈ کے رو رو پڑے ہمارے لیے
سو دور دور تک اپنا اتا پتا ہی نہ ہو

اک ریت کا بگولہ مجھ کو اچک رہا تھا
خود اپنی جستجو تھی سو میں بھٹک رہا تھا

کمرے میں اک اداسی کیسی مہک رہی تھی
آنکھوں سے ایک آنسو کیسا چھلک رہا تھا

یہ بارِ جسم آخر میں نے اٹھا لیا ہے
اعضا چیخ رہے تھے اور میں بھی تھک رہا تھا

مجھ میں کسی کی صورت کیا گل کھلا رہی تھی
باہر سے ہنس رہا تھا اندر سسک رہا تھا

یہ میری خامشی بھی لے جائے گی کہاں تک
میں آج صرف اس کی آواز تک رہا تھا

شاعری

نظمیں

قرۃ العین فاطمہ

تخلیق

میں کتنی دیر سے
آنکھیں بند کیے بیٹھی ہوں
جیسے سانس لینے کو
اور زندگی کرنے کو
کوئی بہانہ نہ مل رہا ہو
جیسے آنسو اور درد
بے معنی ہوں
جیسے اپنا وجود
دوسروں کی ضروریات کا
ایک ذریعہ ہو
جیسے ہنسی اور خوشی
اور رنگ برنگی دنیا
کسی خواب کا حصہ ہوں
میں کب سے آنکھیں بند کیے بیٹھی ہوں
اور یکے بعد دیگرے
کئی دھماکوں سے
کتنی دنیائیں تخلیق ہو کر
اجڑ چکی ہیں

اسم

مجھ پر وارد ہوا ہے
کوئی اسم
جس کا حجم
زمان و مکاں سے بڑا ہے
بے پر ہے
مگر اڑتا ہے
بے آواز ہے
مگر بولتا ہے
بے گھر ہے مگر
ہر گھر میں ہے
سانس لیتا ہے
میرے ساتھ جیتا ہے
میرے ورد میں رہتا ہے
مجھ میں لحہ لحہ اُترتا ہے!

شاعری

نظمیں

عالیہ مرزا

رت جگوں کا مارا وقت

صدیوں کا سفر طے کر کے
وقت کے دروازے پر پہنچی تو معلوم ہوا
رتجگوں کا مارا وقت
دن چڑھے تک سو رہا ہے
وہ جو کبھی رُکا نہیں
کسی کے آگے جھکا نہیں
میرے آنے سے پہلے اسے نیند کیوں آ گئی ؟
ہتھیلیوں پہ دستکوں کے ہزار ہا نشان ہیں
اور اسے خبر نہیں
شکستگی سمیٹ کر پاؤں میں باندھ لائی ہوں
اب آبلوں میں سکت نہیں
یہ مسافت بھی رائیگاں نہ جائے کہیں
مجھے وقت کو جگانا ہے اور اُسے بتانا ہے
کہ میں نے عمر کے جس تندور میں
اپنے دکھ دابے تھے
وہ پھر سے اگنی مانگ رہا ہے
نیندیں اب تک سلگ رہی ہیں!

درد کا کوئی انت نہیں ہے

درد کا کوئی انت نہیں ہے
اس میں جیون پگھلا جائے
دور گلی کی نکڑ پر
زرد اُداسی کا ڈیرا ہے
اور لیمپ پوسٹ کی روشنی میں
تنہائی کا بسیرا ہے
آنگن میں جب اُترے پرندے
یادوں کا چوگا ختم ہوا
خالی کٹورا درد بھرا تھا
درد کا کوئی انت نہیں ہے

قطعات

شاعری

مسعود جعفری

لو میں ہوتا نہیں جہاد کوئی
کوئی آباد تو برباد کوئی
دل اگر جیت جیت جائے تو
کوئی شاداب ہے تو شاد کوئی

مجھے قلق تو یہی ہے کہ تو نہیں باقی
میں تجھ سے کیسے کہوں جام لا مرے ساقی
مئے عناب سے بجھتی نہیں ہے پیاس مری
اسی لیے تو یہ ہوتی رہے گی ناچاقی

دوروزہ اس جہاں میں کرے گا یقیں بھی کیا
دن میں ہزار بار جھکے گی جبیں بھی کیا
باہر نکل کے آگئیں پردہ نشین بھی کیا
مردہ ضمیر ہو گئے سارے مکیں بھی کیا

ابرو ہوا پہ روک لگا اور بات کر
دن میں بھی آفتاب بجھا اور رات کر
غارت گری کا سلسلہ رکنے نہ دے کہیں
ہندوستاں کو اور بہت بے ثبات کر

ناصر شاہی برہانپوری

ٹھہرے پانی میں شب کو اس طرح
عکس تاروں کا جھلملا تا ہے
ایک شاعر کے دل میں جس طرح
اس کا احساس تلملا تا ہے

مرے جذبات کے شبستاں میں
خونِ دل سے چراغ جلتے ہیں
میرے شعروں کی آنچ سے اکثر
سنگ و آہن کے دل پگھلتے ہیں

پیار، ایثار اور مروت کا
موجزن جس میں دریا رہتا ہے
کس قدر پاک ہے وجود اس کا
جس کو عورت زمانہ کہتا ہے

روتے روتے کبھی ہنسی آئی
ہنستے ہنستے کبھی پڑا رونا
کس قدر درناک ہوتا ہے
آپ کا اس طرح خفا ہونا

علم سے جب کسی نے یہ پوچھا
تیری خوبی ہے کونسی بتلا
ہنس کے بولا کہ زر پرستوں پر
میرا سایہ کبھی نہیں پڑتا

صابر علی سیوانی

خراج عقیدت

کارواں گزر گیا غبار دیکھتے رہے

میں نے اب تک جتنی عظیم شخصیتوں کی سوانح حیات پڑھی ہے ان میں ایک بات تو قدر مشترک کے طور پر محسوس کی ہے کہ وہ تمام شخصیات جدو جہد غربت، تنگ دستی اور بے سرو سامانی کا برسوں شکار رہیں، انھی عظیم اور نامور شخصیات میں سے ایک نام ہندی کے کوی اور فلم نغمہ نگار گوپال داس نیرج کا بھی ہے، جن کا 19/ جولائی 2018ء نئی دہلی میں انتقال ہوگیا۔ گوپال داس نیرج 4/ جنوری 1925ء کو اتر پردیش کے اٹاوہ کے گاؤں پوراولی میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد بابو برج کشور سکسینہ کا انتقال اس وقت ہو گیا جب نیرج کی عمر محض چھ سال تھی۔ چار بھائیوں میں وہ دوسرے نمبر پر تھے۔ والد کا سایہ سر سے اس کم عمری میں اٹھ جانے کے بعد نیرج کو سخت مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ ان کی غربت اور مالی مشکلات کا اندازہ اس واقعے سے لگایا جا سکتا ہے کہ گوپال داس نیرج ایک کوی سمیلن (مشاعرہ) کے سلسلے میں اندور جا رہے تھے۔ یہ کوی سمیلن اندور کے گاندھی ہال میں منعقد ہونے والا تھا۔ اس سفر میں انھوں نے دوسرے شعرا سے گفتگو کے دوران اس حقیقت کا انکشاف کیا کہ ''گنگا کنارے، ہمارا گھر ہوا کرتا تھا اور گھر میں بیحد غربت تھی۔ جو لوگ گنگا ندی میں پانچ پیسے دس پیسے پھینکتے تھے ہم دوسرے بچوں کے ساتھ گنگا میں غوطا لگا کہ وہ پھینکے ہوئے پیسے نکال کر اکٹھا کرتے تھے اور اس جمع پونجی سے ہمارے گھر کا چولھا جلتا تھا۔ یہ ان کی خودداری رہی کہ اپنی غربت کا انھوں نے کبھی بھی کہیں بھی ذکر نہیں کیا۔

نیرج نے 1942ء میں ایٹہ سے اول درجے میں ہائی اسکول پاس کیا بعد ازاں اٹاوہ کچہری میں ٹائپسٹ کے طور پر کام کیا۔ اس کے بعد سنیما گھر کی ایک دکان پر نوکری کر لی۔ وہاں کئی برسوں تک بیکار رہنے کے بعد دلی چلے گئے، جہاں سپلائی ڈپارٹمنٹ میں ٹائپسٹ کی نوکری کر لی۔ بعد میں کانپور کے ڈی اے وی کالج میں بطور کلرک ملازمت مل گئی۔ اس کے بعد بائیک برادرس کی پرائیویٹ کمپنی میں پانچ برسوں تک ٹائپسٹ کا کام کرتے رہے۔ چوں کہ ان کے گھریلو حالات اچھے نہیں تھے، اس لیے نوکری کرنے کے ساتھ ساتھ پرائیوٹ امتحانات دے کر 1949ء میں انٹرمیڈیٹ، 1951ء میں بی اے اور 1953ء میں ہندی ادب میں ایم اے کیا جس میں انھیں اول مقام حاصل ہوا۔ میرٹھ کالج، میرٹھ میں کچھ دنوں تک پڑھانے کا کام کیا، لیکن ان پر کچھ الزامات لگائے گئے جس کے باعث نیرج نے وہاں کی نوکری چھوڑ دی اور علی گڑھ چلے آئے۔ علی گڑھ کے دھرم سماج کالج میں ہندی کے لکچرر مقرر کیے گئے اور میرس روڈ جنک پوری علی گڑھ میں وہ اپنا مکان بنوا کر مستقل طور پر وہیں رہنے لگے۔ اس دوران وہ مشاعروں اور کوی سمیلنوں میں کافی مقبول ہو چکے تھے۔ کوی سمیلنوں میں زبردست مقبولیت کی وجہ سے انھیں ممبئی کی فلم نگری سے فلموں کے نغمات لکھنے کی پیش کش ہونے لگی 1964ء میں ممبئی آ گئے۔ ''نئی عمر کی نئی فصل'' کے گیت لکھنے کے لیے انھیں کہا گیا۔ اس پہلی ہی فلم سے لکھے گے ان کے دو گیت جیسے کارواں گزر گیا غبار دیکھتے رہے'' اور ''دیکھتی ہی رہو آج درپن نہ تم'' پیار کا یہ مہورت نکل جائے گا'' کافی مقبول ہوئے۔ اس مقبولیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اب نیرج ممبئی میں ہی رہ کر فلموں کے گیت لکھنے لگے۔ بہت جلد فلمی دنیا میں مقبول ہو گئے۔ فلم ''میرا نام جوکر'' (اے بھائی ذرا

دیکھ کے چلو) چندا اور بجلی (کال کا پہیا گھومے رے بھیا) فلم پہچان (بس یہی اپرادھ میں ہر بار کرتا ہوں، آدمی ہوں آدمی سے پیار کرتا ہوں، میں لکھے ان کے مذکورہ نغموں کے لیے فلم فیئر ایوارڈ سے نوازا گیا۔ 1970ء میں فلم چندا، 1971ء میں فلم پہچان اور 1972ء میں فلم ''میرا نام جوکر'' میں لکھے گئے ان کے مذکورہ نغموں کے لیے انھیں لگاتار تین برسوں تک فلم فیئر ایوارڈ ملتا رہا۔ نیرج پہلے شخص ہیں جنھیں تعلیم اور ادب کے شعبے میں حکومت ہند نے دو بار اعزاز سے نوازا۔ 1991ء میں پدم شری اور 1994 میں انھیں پدم بھوشن سے نوازا گیا۔ 1994ء میں اتر پردیش ہندی سنستھان نے ''یش بھارتی انعام' سے سرفراز کیا۔ نیرج کو عالمی اردو انعام سے بھی نوازا گیا۔ وہ بیک وقت اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں اپنی تخلیقات لکھا کرتے تھے۔ ان کے کچھ اور مستقل نغموں کی تفصیل یہ ہے'' لکھے جو خط تمھیں، وہ تیری یاد میں، ہزاروں رنگ کے نظارے بن گئے (فلم کنیا دان) کھلتے ہیں گل یہاں کھل کے بکھرنے کو (فلم شرمیلی)، آج مدہوش ہوا جائے رے میرا من (شرمیلی) شوخیوں میں گھولا جائے پھولوں کا شباب، اُس میں پھر ملائی جائے تھوڑی سی شراب (فلم پریم پجاری)، دل آج شاعر ہے غم آج نغمہ ہے، شب یہ غزل ہے صنم (فلم گیمبلر) وغیرہ۔

نیرج کی وفات پر انھیں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے مشہور شاعر راحت اندوری نے کہا کہ 'وہ ایک سیکولر تخلیق کار تھے اور انھوں نے ہندی اور اردو کے اسٹیجوں پر ہمیشہ محبت تقسیم کی۔ نیرج کے بارے میں سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ جتنے نامور ہندی نظموں کے اسٹیجوں پر تھے انھیں اتنی ہی شہرت اور محبت اردو شاعری کے اسٹیج پر بھی حاصل تھی ۔ وہ ایک سیکولر ہندوستانی کے ساتھ ایک سیکولر شاعر بھی تھے۔ ہمارے یہاں آج کل دِقت یہ ہے کہ ہندی کو یتا کے اسٹیج پر بیشتر شاعر ہندو ہوجاتے ہیں اور اردو مشاعروں میں زیادہ تر شاعر مسلمان ہوجاتے ہیں، لیکن نیرج ایسے قطعی نہیں تھے اور ہر اسٹیج پر سب کے ساتھ ہمیشہ محبت بانٹتے تھے۔ نیرج شاعری کا ایک پورا عہد تھے، لوگوں نے نصف صدی سے بھی زیادہ انھیں غزل پڑھتے سنا ہے اور زندگی کے تئیں ان کے فلسفے کو سمجھا ہے''

نیرج نے اردو اور ہندی میں سیکڑوں غزلیں، نظمیں، گیت اور دوہے تخلیق کیے۔ ان کی شاعری میں سیکولر روایت کی پاسداری کی وکالت اکثر و بیشتر مقامات پر دیکھی جاسکتی ہے۔ وہ کسی مذہب کی برتری کی بات نہیں کرتے بلکہ انسان کے انسانیت کی رفعت کی وکالت کرتے ہیں اور اکثر و بیشتر جگہوں پر یہ صفت ان کی شاعری کا حصہ بنتی ہے۔ راحت اندوری نے درست کہا ہے کہ وہ ایک سیکولر تخلیق کار تھے اور انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ ہمیشہ محبت بانٹنے کا کام کیا ہے اور اس انتشار زدہ معاشرے میں جب کہ ہندوستان مذہبی طور پر بہت شدت پذیر بنتا جارہا ہے ایسے فنکار کو عام کرنے کی شدید ضرورت ہے۔ نیرج کی شاعری کے یہ حصے دیکھیے جس میں انھوں نے محبت بانٹنے اور انسانیت کی دولت کو تقسیم کرنے کی بات کہی ہے۔

اب تو مذہب کوئی ایسا بھی چلا یا جائے
جس میں انسان کو انسان بنایا جائے
جس کی خوشبو سے مہک جائے پڑوسی کا بھی گھر
پھول اس قسم کا ہر سمت کھلایا جائے
آگ بہتی ہے یہاں گنگا میں جھیلم میں بھی
کوئی بتلائے کہاں جا کے نہا یا جائے
میرے دکھ درد کا تجھ پر ہو اثر کچھ ایسا
میں رہوں بھوکا تو تجھ سے بھی نہ کھایا جائے
جسم دو ہو کے بھی دل ایک ہوں اپنے ایسے

میرا آنسو تری پلکوں سے اٹھایا جائے

یہاں نیرج نے ہندو مسلم اتحاد کو اس طرح پیش کیا ہے کہ ایسا لگتا ہے کہ وہ اس معاشرے کے رسم ورواج سے نالاں ہیں وہ گنگا اور جھیلم کی بات کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ دونوں میں نفرت کا زہر بہہ رہا ہے۔ بھلا کوئی بتائے کہ کہاں جا کر نہایا جائے۔ گنگا ندی ہندوستان میں اور جھیلم کشمیر سے پاکستان میں بہتی ہے۔ اس جانب ان کا اشارہ ہے کہ دونوں ملکوں کی ندیاں آلودہ ہو چکی ہیں اور یہ آلودگی اس احساس سے پیدا ہوئی ہے کہ دونوں مذہب کے نام پر ایک دوسرے کو نفرت سے دیکھتے ہیں۔ نیرج ایسی خوشبو کو پھیلانے کی بات کرتے ہیں جس سے پڑوسی کا گھر بھی معطر ہو جائے۔ انسانیت کی تعریف نہیں کی جاتی ہے کہ جس کے باعث ایک دوسرے کا دکھ درد اپنا دکھ درد محسوس ہونے لگے اور یہی بات انھوں نے اس شعر میں کہی ہے کہ میرے دکھ اور درد کا تجھ پر کچھ ایسا اثر ہونے لگے کہ اگر میں بھوکا رہوں تو تجھ کو بھی کھانا اچھا نہ لگے ایسے شاعر کی تخلیقات سے ہم اردو داں کو بھی روشناس ہونا چاہیے اور ہندی اردو کی دیوار ختم کر کے ایسے شاعروں کی تخلیقات سے استفادہ کرنا چاہیے۔ نیرج نے چھوٹی بحر میں بھی بہت اچھی غزلیں موزوں کی ہیں۔ ان غزلوں میں بھی انھوں نے انسانیت کا درس دینے کی حتی المقدور کوشش کی ہے۔ ملاحظہ کیجیے ایسے ہی چند اشعار جو نہایت چھوٹی بحر میں ہیں۔

جتنا کم سامان رہے گا
اتنا سفر آسان رہے گا
اس سے ملنا نا ممکن ہے
جب تک خود کا دھیان رہے گا
ہاتھ ملیں اور دل نہ ملیں
ایسے میں نقصان رہے گا

چونکہ نیرج بنیادی طور پر ہندی کے کوی کے طور پر جانے جاتے ہیں، اس لیے ان کی غزلوں میں بھی جا بجا ہندی کے الفاظ ملتے ہیں، لیکن یہ الفاظ اتنے ثقیل نہیں ہوتے کہ سمجھ میں نہ آسکیں۔ وہ اپنی شاعری کو مقصدیت کا جامہ پہنانے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہ ملکی مسائل اور روزی روٹی کی مشکلات کی بھی بات کرتے ہیں۔ وہ زندگی کی ناہمواریوں کو بھی موضوع بناتے ہیں۔ اپنوں کے درمیان رہتے ہوئے اس اجنبیت کے احساس کی بات بھی کرتے ہیں جو ہر شخص اس معاشرے میں محسوس کرتا ہے۔ یہی تو وہ خصوصیات ہیں، جس کے باعث وہ ہندی کی سرحد کو پار کرتے ہوئے اردو کے حدوں میں داخل ہو جاتے ہیں اور برملا طور پر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ۔

تمام عمر میں اک اجنبی کے گھر میں رہا
سفر نہ کرتے ہوئے بھی کئی سفر میں رہا
وہ جسم ہی تھا جو بھٹکا کیا زمانے میں
ہردَے تو میرا ہمیشہ میری ڈگر میں رہا
وہ اور ہی تھے خبر تھی جنھیں ستاروں کی
مرا یہ دیش تو روٹی کی ہی خبر میں رہا

ان اشعار میں ہندی کے الفاظ ضرور استعمال ہوئے ہیں لیکن یہ مشکل الفاظ نہیں ہیں مثلاً ڈگر (راستہ) ہردَے (دل) وغیرہ

نیرج نے روزی روٹی کے مسئلے کو یہاں نمایاں طور پر پیش کرنے کی کوشش کی ہے کیوں کہ اس وقت ہمارے ملک کا یہ سب سے بڑا مسئلہ ہے۔ جس کی جانب حکومت کی کوئی خاص توجہ نہیں ہے۔ یہاں کی حالت تو یہ ہے کہ ڈیجیٹل اور تکنیکی طور پر اس ترقی یافتہ دور میں بھی کئی انسان بھوک سے دم توڑ دیتے ہیں اور انھیں کوئی دو وقت کی روٹی تک مہیا نہیں کرتا اور جب اس شخص کی بھوک سے موت ہو جاتی ہے تب حکومت کی نیند کھلتی ہے اور میڈیا والے اس بھوک سے مرنے والے شخص کی داستان سناتے اور

دکھاتے ہیں۔ ہمارے ملک کا اس سے بڑھ کر المیہ کیا ہوسکتا ہے؟

نیرج کی زندگی جدو جہد رنج والم اور مشکلات سے بھری تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں بھی کہیں نہ کہیں ان مشکلات کا عکس دکھائی دے جاتا ہے اور جس کی زندگی ایسے ہی آزمائشوں سے گزری ہو، وہ اس میں اپنا عکس اور اپنا درد محسوس کرنے لگتا ہے۔

دور سے دور تلک ایک بھی درخت نہ تھا
تمہارے گھر کا سفر اس قدر بھی سخت نہ تھا
میں جس کی کھوج میں خود کھو گیا تھا میلے میں
کہیں وہ میرا ہی احساس تو کمبخت نہ تھا
شراب کر کے پیا اس نے زہر جیون بھر
ہمارے شہر میں نیرج سا کوئی مست نہ تھا

نیرج کی تخلیقات پر مشتمل ہندی میں متعدد مجموعے شائع ہوتے ہیں، لیکن اردو میں ان کا کوئی مجموعہ کلام نہیں چھپا ہے۔ اردو والوں کو اس جانب توجہ دینے کی ضرورت ہے کیوں کہ ہم کسی بھی فنکار کی قدر اس کی زندگی میں کم کرتے ہیں، اس کی موت کے بعد ہمارے دل میں اس کی قدر بہت زیادہ بڑھ جاتی ہے۔ نیرج کے مجموعہ کلام کے نام یہ ہیں۔ گیت جو گائے نہیں، درد دیا ہے، آسواری بادلوں سے سلام لیتا ہوں، کچھ دوہے نیرج کے، نیرج کی پاتی، نیرج دوہاولی، کارواں گزر گیا، ندی کنارے، لہر پکارے، پھر دیپ جلے گا، تمہارے لیے، نیرج کی گیت کائیں وغیرہ۔ ان کے لکھے فلمی نغموں کے مشہور مصرعے یا اس کے ابتدائی حصے اس طرح ہیں۔ رادھا نے مالا جپی شیام کی، ریشمی اجالا ہے مخملی اندھیرا، کہتا ہے جو کر سارا زمانہ، آدمی ہوں آدمی سے پیار کرتا ہوں، رنگیلا تیرے رنگ میں، کھلتے ہیں گل یہاں کھل کے بکھرنے کو، ملتے ہیں دل یہاں مل کے بچھڑنے کو، میگھا چھائے آدھی رات بیرن بن گئی نیندیا، بتا دے میں کیا کروں، وہ ہم نہ تھے وہ تم نے تھے، لکھے جو خط تجھے وہ تیری یاد میں ہزاروں رنگ کے نظارے بن گئے، سویرا جب ہوا تو پھول بن گئے جورات آئی تو ستارے بن گئے اور جیون کی بگیا مہکے گی مہکے گی، چہکے گی خوشیوں کی کلیاں جھومیں گی، جھولیں گی، پھولیں گی۔ جیون کی بگیا وغیرہ۔ شنکر جے کشن، ایس ڈی برمن، اور سچن دیو برمن کے لیے انھوں نے زیادہ تر گیت لکھے جو ان کی موسیقی کے باعث بہت مقبول ہوئے۔ نیرج اب ہمارے درمیان نہیں رہے، لیکن ان کی تخلیقات ہمارے معاشرے میں موجود ہ کدورتوں اور لغزشوں سے جنگ لڑتی رہیں گی۔

☆☆☆

ساہتیہ اکادمی

کے زیر اہتمام

ہندوستانی ادب کے معمار

کے سلسلے کی ایک کڑی

شاذ تمکنت

بیگ احساس

قیمت: 40 روپے

ملنے کا پتہ: رویندر بھون، 35 فیروز شاہ روڈ،

نئی دہلی 001 110

سیلس آفس، سواتی مندر مارگ، نئی دہلی 001 110

اُویس احمد بٹ

مضمون

جدید غزل کی تخلیقیت (اظہار و بیان اور موضوعاتی مطالعات کے تناظر میں)

اردو ادب میں جدید شاعری کی اصطلاح ۱۸۵۷ء میں وضع ہوئی ہے۔ اُس وقت حالؔی اور آزادؔ نے حقیقتِ حال، عصری تقاضے اور انگریزی ادب کے زیر اثر جو شاعری تخلیق کی اُسے جدید شاعری کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ لیکن متذکرہ جدید شاعری اور جدیدیت سے اِس کے علاوہ کوئی ربط نہیں کہ اُس تجربے نے اردو شاعری میں نئے تجربات کا ایک ایسا سلسلہ شروع کیا جو مختلف ادوار سے گذرتا ہوا جدیدیت کے عصری تجربے تک آ جاتا ہے۔ غزل میں جدیدیت کا اظہار اگرچہ ۱۹۵۵ء سے ۱۹۶۰ء کے درمیان ہونے لگا تھا لیکن ۱۹۷۰ء تک غزل نے اپنی شناخت قائم کر لی تھی۔ جدید غزل طے شدہ نظریوں، فارمولوں اور وقتی و ہنگامی نصب العین سے انکار کرتی ہے۔ پُرانے سہاروں کو چھوڑ کر صرف ذاتی تجربے، مشاہدے اور ادراک کی مدد سے دُنیا کی حقیقت کو دریافت کرنے کے عمل پر یقین رکھتی ہے، نئی حقیقتوں کی موجودگی کا احساس دلاتی ہے، انسان کے تنہا ہونے اور تنہائی کے کرب کی ترجمانی کرنے پر مجبور کرتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جدید غزل کو کسی فرسودہ خانے میں مقید نہیں کیا جا سکتا ہے۔ جدید غزل نہ تو قنوطی شاعری کے ذیل میں آتی ہے، نہ رجائی شاعری کے، نہ اشتراکیت پر اصرار کرتی ہے، نہ سیاست پر، نہ ہوسنا کی کی طرف اشارہ کرتی ہے، نہ معاملہ بندی کی طرف بلکہ اپنے مخصوص ایمائی، استعاراتی، علامتی اور پیکری طریق کار کی مدد سے عالمگیر انسانی جذبات ومحسوسات کو اپنے دائرے اظہار میں لے لیتی ہے۔ جدید غزل کی لفظیات میں اور اُس کے استعمال کے طریقے میں فرق آیا ہے نیز اُس کے استعارے اور علامتیں بھی بدل گئی ہیں۔ اُس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ نئی سچائیوں کے ادراک اور اظہار کے لیے پرانی تشبیہات اور استعارات موزوں معلوم نہیں ہوتے تھے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ نئے موضوعات کو نئے انداز میں پیش کرنے اور ترسیل کے ذرائع ناکافی ثابت ہو رہے تھے۔ اسی لیے نئے اسلوب کی ضرورت محسوس ہوئی۔ نئی تشبیہات اور علامتیں وضع ہوئیں نیز ذاتی تجربات وتاثرات کی سطح پر نئے نئے پیکر صورت پذیر ہوئے۔ اس ضمن میں بشیر بدر اپنی کتاب ''آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ'' میں رقمطراز ہیں:

> ''اس دہائی کی غزل میں تجربہ واحساس کی تازہ، وسیع، عمیق، پیچیدہ دنیا کا اظہار، پرانی لفظیات کی نئی معنویت، نئی لفظیات، اچھوتی تشبیہات، پیچیدہ اور خوبصورت استعارے، تجسیم (Personification) بلیغ اشاریت، نئی زندگی اور قدرتی مناظر کی پیکر تراشی، خوبصورت ایہام، خوفزدہ ایہام کے ساتھ ہوا ہے۔ سورج، ہوا، سایہ، بے چہرگی کا استعمال نئے سیاق وسباق میں نئی معنویت کے ساتھ استعاراتی اور علامتی رنگ میں ہوا ہے۔ نیچر سے غزل کی ردیفیں مثلاً سورج، چاند، دھوپ، بادل، درخت، پتھر وغیرہ لی گئی ہیں۔'' [۱]

جدید غزل کے موضوعات میں اگرچہ تنوع پایا جاتا ہے، لیکن جدید غزل کی سب سے بڑی خصوصیت اُس کی زبان ہے۔ جدید غزل نئے ذہن کی کیفیات و احساسات کی پیداوار ہے۔ جس میں ایک نئی فضا اور نیا ذائقہ ملتا ہے۔ حالاں کہ جدید

غزل نے اردو شاعری میں رائج پرانی لفظیات کو سرے سے خارج کر دیا ہے اور پرانی لفظیات کی جگہ نئے الفاظ اور علامات کو داخل کر دیا۔ جدید غزل نے اردو غزل کی فرسودگی اور اُکتا دینے والی لفظیات کو دائرے سے باہر کر دیا اور اُن کی جگہ ایسی لفظیات اور علامتیں استعمال کیں جو ہمارے جدید سماج اور ماحول سے بالکل قریب تر تھیں۔ اِس بات کی تائید خلیل الرحمٰن اعظمی بھی کرتے ہیں کہ جدید شعرا نے اپنی ذہنی کیفیات کے لیے پہلے سے رائج علامتوں کو ناکافی سمجھا۔ اسی لیے جدید شعرا نے اپنی زندگی اور ماحول کے مطابق نئی لفظیات خلق کیں۔ جدید غزل کی لفظیات معنی کی کن نئی سطحوں اور نئی جہات کو اُبھارتی ہیں، اس سلسلے میں کچھ اشعار بہ طور مثال درج ہیں:

فصیلِ جسم پہ تازہ لہو کے چھینٹے ہیں
حدودِ وقت سے آگے نکل گیا ہے کوئی (شکیب جلالی)

دھوپ نکلی دن سہانے ہو گئے
چاند کے سب رنگ پھیکے ہو گئے (ناصر کاظمی)

فصیلِ شوق اُٹھانا ظفر ضرور مگر
کسی طرف سے نکلنے کا راستہ رکھنا (ظفر اقبال)

دھوپ کے قہر لا ڈر ہے تو دیارِ شب سے
سربرہنہ کوئی پرچھائی نکلتی کیوں ہے (شہریار)

میں وہ صحرا جسے پانی کی ہوس لے ڈوبی
تو، وہ بادل جو کبھی ٹوٹ کے برسا ہی نہیں (سلطان اختر)

سلگتی پیاس نے کر لی ہے مورچہ بندی
اسی خطا پہ سمندر خلاف رہتا ہے (کورشید اکبر)

اردو غزل نے جب بھی اپنی روایات کی حدود میں رہتے ہوئے عصری تبدیلیوں اور نئے رجحانات کو قبول کیا ہے وہ پہلے سے زیادہ جاندار، توانا اور تابناک بن کر اُبھری ہے۔ خارجی اور داخلی دونوں سطحوں پر اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہوئے ہر زمانے کا ساتھ دینے اور بدلتے ہوئے حالات کے مطابق خود کو ڈھال لینے کی حیرت انگیز صلاحیت غزل میں پائی جاتی ہے۔ اسی طرح ۱۹۶۰ء کے بعد کی غزل بھی ایک بالکل نئی اور انقلابی فضا لے کر آئی جو اپنے مزاج و منہاج، رنگ و آہنگ، لب و لہجہ، انداز و اسلوب، موضوعات و مضامین ہر اعتبار سے چار دہائی پہلے کی غزل سے یکسر مختلف و منفرد دکھائی دیتی ہے۔ جدید غزل محض اس لیے جدید نہیں ہے کہ وہ تاریخی اعتبار سے نئے زمانے کی پیداوار ہے بلکہ وہ اس لیے جدید ہے کہ ظاہر و باطن، احساس و اظہار، فکر و فن دونوں اعتبار سے جدید زمانے کی چیز معلوم ہوتی ہے۔

جہاں تک جدید غزل کے موضوعات کا سوال ہے، اس میں افراد کے ذہنی رویے، فرد اور زندگی کے رشتے، فرد اور معاشرے اور اُس کے قوانین، اُس کے ردِعمل اور فرد کی داخلی دُنیا جیسے موضوعات نمایاں ملتے ہیں۔ جدید غزل کے مطالعات کے حوالے سے انسان زندگی اور دُنیا کے تمام رشتے ناطوں سے مایوس لگ رہا ہے، اُسے شدید تنہائی کا احساس ہے۔ انسان کی بڑھتی ہوئی انفرادی انا زمانے کی تیز رفتار تبدیلیاں، معاشرے کے تضادات سے بھری مصنوعی تہذیب ،طبقاتی بُعد ،کسی مشترکہ مسئلہ کی عدم موجودگی ،اقدار کی شکست ،فسادات، جنگ، قتل و غارت گری جدید دور کے فرد کو شدید تنہائی اور مایوسی میں مبتلا کرتی ہے۔ زندگی کی بے کیفی، بے حسی، رومانی زندگی کی ناکامی، سفر کی بے سمتی، روح کے بے لباسی، وجود کی برہنگی، داخلی کرب و اضطراب کے پہلو جدید غزل میں نمایاں ہیں۔ انسان خارجی دُنیا سے مایوس ہوکر کرب اور نااُمیدی میں اپنی ہی ذات کی طرف مراجعت کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے جس سے اُسے خود شکستہ، تنہا، خوف زدہ، بے مایہ و بے سہارا اور بے چہرہ ہونے کا احساس لگا رہتا ہے۔ اس ضمن میں چند اشعار

ملاحظہ ہیں:

؎ نکل جاؤ گے اس دشت بیکراں سے کہاں
ہے کوسوں تلک اب دلوں میں تنہائی (ممتاز نجم)

؎ جدھر اندھیرا ہے، تنہائی ہے، اُداسی ہے
سفر کی ہم نے وہی سمت کیوں مقرر کی (شہریار)

؎ رشتے ناطے کچے دھاگے تیز ہوا سے ٹوٹ گئے
تنہائی وہ صحرا ہے جس کا ہر کوئی زندانی ہے (خلیل الرحمٰن

؎ تمہاری رفاقت ہے چند قدموں کی
تمہارے پاؤں کا چھالا ہوں ٹوٹ جاؤں گا (سلیمان اریب)

؎ ہزار چہرے ہیں موجود آدمی غائب
یہ کس خرابے میں دنیا نے لا کے چھوڑ دیا (شہزاد احمد)

مذکورہ بالا اشعار سے یہ بات عیاں ہوجاتی ہے کہ جدید غزل میں تنہائی، بے گانگی، علیحدگی، خلوت پسندی، تشکیک نیز مسئلہ ہجرت، فرقہ وارانہ فسادات، بے گھری کا دُکھ، ظلم و جبر کے خلاف ایک رویہ نمایاں نظر آتا ہے۔ اس کے علاوہ سائنسی ایجادات کے مضر اثرات کے تئیں تشویش جیسے موضوعات کو بھی جدید غزل نے اپنی ایمائیت برقرار رکھتے ہوئے ایک منفرد اظہار و بیان اور مخصوص لفظیات میں بیان کیا ہے۔ شمس الرحمٰن فاروقی جدید شاعری کے موضوعات کے حوالے سے اپنے ایک مضمون بعنوان ''نئی شاعری: ایک امتحان'' میں لکھتے ہیں:

''داخلی اور معنوی حیثیت سے میں اُس شاعری کو ''جدید'' سمجھتا ہوں جو ہمارے دور کے احساس جرم، خوف، تنہائی، کیفیت انتشار اور اُس ذہنی بے چینی کا کسی نہ کسی نہج سے اظہار کرتی ہو جو جدید صنعتی اور مشینی اور میکانکی تہذیب کی لائی ہوئی مادی خوشحالی، ذہنی کھوکھلے پن، روحانیہ دیوالیہ پن اور احساس بے چارگی کا عطیہ ہے۔'' ۲

جدید غزل میں انفرادی و اجتماعی دونوں سطحوں پر سماجی بیزاری، مسلسل سوال اور ذہنی تجسس، تنہائی، اُداسی، بے تعلقی اور بے گانہ روی، عدم تحفظ، گھبراہٹ، خوف، احتجاج، عورت اور مرد کے درمیانی مساوات، اپنی بنیاد اور اپنی زمین سے بچھڑنے کا غم، صارفیت کا رجحان، انسانی زندگی میں مشین کی بالادستی وغیرہ ایسے موضوعات ہیں جو دور جدید کے فرد کی سیاسی و سماجی زندگی سے سروکار رکھتے ہیں۔ جدید شاعری کے موضوعات گردانتے ہوئے وحید اختر لکھتے ہیں:

''اپنی ذات، اس کی زخم شماری، خواب دیکھنے اور اُن کی تعبیر ڈھونڈھنے کا عمل، عشق اور اس جذبے کی مختلف و متنوع تصویریں، زندگی کی چھوٹی چھوٹی محرومیاں، خوشیاں، اُمید و بیم اپنے ایسے دوسرے انسانوں کے مسائل اور اُن کا غم، انفرادی اور اجتماعی طور پر بہتر زندگی کی آرزو اور اُس کو پانے لے لیے حوصلہ۔'' ۳

جدید غزل کے موضوعات و مضامین کا جہاں تک سوال ہے، اردو غزل میں عشق ایک بنیادی موضوع رہا ہے۔ لیکن جدید غزل کا عشق پہلے کی غزل کے عشق سے مختلف دکھائی دیتا ہے۔ جدید غزل کے عشق کی پہچان اُس کی ارضیت، مادیت اور واقعیت سے ہوتی ہے جو جدید دور کے معاشرتی حالات اور تہذیبی عوامل کی دین ہے۔ چند اشعار بہ طور مثال:

؎ کوئی ہلچل ہے نہ آہٹ نہ صدا ہے کوئی
دل کی دہلیز پہ چپ چاپ کھڑا ہے کوئی (خورشید احمد جامی)

؎ بھلا ہوا کہ کوئی اور مل گیا تم سا
وگرنہ ہم بھی کسی دن تمہیں بھلا دیتے (خلیل الرحمٰن اعظمی)

؎ اُس سے بچھڑے وقت میں رویا تھا خوب سا
یہ بات یاد آئی تو پہروں ہنسا کیا (محمد علوی)

؎ نہ سرد ہوگی کبھی اُس کے قرب کی خواہش
وہ خون بن کے مرے جسم میں مچلتا ہے (ممتاز راشد)

؎ برسوں کی خامشی کی گرہ کھولنے لگا
تو کیا ملا کہ سارا بدن بولنے لگا (مدحت الاختر)

؎ میرے چومے ہوئے ہاتھوں سے
اوروں کو خط لکھتا ہوگا (ناصر کاظمی)

؎ وہ اُس ادا سے جو آئے تو کیوں بھلا نہ لگے
ہزار بار ملو پھر بھی آشنا نہ لگے (ایضاً)

؎ میں تو اُس کو دیکھتے ہی جیسے پتھر ہو گیا
بات تک منھ سے نہ نکلی بے وفا کے سامنے (منیر نیازی)

؎ اب ملیں ہم تو کئی لوگ بچھڑ جائیں گے
انتظار اور کرو اگلے جنم تک میرا (بشیر بدر)

اسی طرح جدید غزل میں تنہائی (Lonliness) کا موضوع بھی خاص طور سے نمایاں رہا ہے۔ جدید غزل میں فرد کی داخلیت میں تنہائی کا کردار بہت اہم ہے۔ بے تعلقی، بے گانگی، علیحدگی جیسی چیزیں اِسی تنہائی کے انسلاکات ہیں۔ جدید غزل کے انسان کی شخصیت میں ایک لامتناہی خلا پیدا ہو گیا ہے، جو اُسے اندر ہی اندر کھائے جا رہا ہے۔ جدید غزل کا انسان اپنے معاشرے کا حصہ ہوتے ہوئے بھی اُس سے الگ دکھائی دیتا ہے۔ احساس تنہائی کے ساتھ ساتھ جدید غزل میں انسان کو جن احساسات و کیفیات اور مسائل و معاملات سے دوچار ہونا پڑتا ہے، اُن میں انتشارِ ذات وتحفظِ ذات کے مسائل، بے سمتی و کج رفتاری، بے مقصدی و لاحاصلی اور ہجرت وغیرہ بھی شامل ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہو:

؎ گذری تمام عمر اسی شہر میں جہاں
واقف سبھی تھے کوئی پہچانتا نہ تھا (بسمل کرشن اشک)

؎ رفیق و یار کہاں اے حجاب تنہائی
بس اپنے چہرے کو تکتا ہوں آئینہ رکھ کے (محمود ایاز ۹

؎ تنہائی کی یہ کون سی منزل ہے رفیقو
تا حدِّ نظر ایک بیابان سا کیوں ہے (شہریار)

؎ پھیلا ہوا تھا شہر میں تنہائیوں کا جال
ہر شخص اپنے اپنے تعاقب میں غرق تھا (سلطان اختر)

؎ یوں تو ہر شخص اکیلا ہے بھری دنیا میں
پھر بھی ہر دل کے مقدر میں نہیں تنہائی (ناصر کاظمی)

؎ لوگ ہی آن کے یکجا مجھے کرتے ہیں کہ میں
ریت کی طرح بکھر جاتا ہوں تنہائی میں (ظفر اقبال)

؎ میں سانپ بن کے نکلوں گا مٹی کے بطن سے
تنہائی کے کھنڈر میں مرا انتظار دیکھ (عادل منصوری)

؎ کوئی صورت مجھے دے دو کہ ترستا ہوں میں
میری تعمیر کی مٹی ابھی نم ہے دیکھو (شاذ تمکنت)

؎ اجنبی ہیں دور دیوار نئے ہیں آثار
کچھ بتاؤ مجھے کیسا تھا مرا گھر لوگو (رشیدہ عیاں)

؎ شکم کی آگ لیے پھر رہی ہے شہر بہ شہر
سگِ زمانہ ہیں ہم کیا، ہماری ہجرت کیا (افتخار عارف)

جدید غزل میں جہاں تنہائی، بے تعلقی و بے چارگی کا احساس ملتا ہے وہیں بے گانگی کا احساس بھی نمایاں ہے۔ دراصل یہ احساس جدید دور کی مادیت اور ہوسِ مال و زر کی وجہ سے ہے کہ انسان کو اچھی قدروں کی شناخت ہی نہیں رہی ہے۔ یہاں تک کہ اُسے اپنی ذات کا ادراک بھی نہیں رہا اور اپنے آپ کو اجنبی اور بے گانہ متصور کرنے لگا۔ جدید غزل کی اس بے چہرگی اور بے گانگی کا

تعلق انسان کی ذات اور اُس کے معاشرے سے ہے۔ جدید غزل میں بے گانگی یا بے چہرگی کا احساس مندرجہ ذیل اشعار سے خوب ہوتا ہے:

؎ اب تو اپنے آپ کو بھی اجنبی لگتا ہوں میں
کون مجھ سے چھین کر میری نشانی لے گیا (سلطان اختر)

؎ تمام شہر میں بے چہرگی کا عالم ہے
جسے بھی دیکھئے گرد اور دھواں دکھائی دے (شہاب جعفری)

؎ کس نے چرالیں صورتیں اُس کی کہ یوں ہوا
بے چہرگی کے غم سے فگار اور آئینہ (فضا ابن فیضی)

؎ اپنی تصویر بناؤ کے تو ہوگا احساس
کتنا دشوار ہے خود کو کوئی چہرہ دینا (اظہر عنایتی)

جدید غزل کے فکری نظام میں نہ صرف انسان اپنی ذات کو توجہ کا مرکز بناتا ہے بلکہ اُس دور کی عام زندگی اور عام لوگوں کے محسوسات کا بھی اظہار کر دیتا ہے۔ جدید غزل میں زندگی کو کسی نظریئے یا رویہ کا سہارا لے کر دیکھا نہیں جاتا ہے۔ جدید غزل میں زندگی کی پریشانیوں اور اُلجھنوں کے اظہار کی مختلف جہتیں ملتی ہیں۔ مثال:

؎ شعلہ شعلہ زمیں، برق برق آسماں اور میں
راستے کی تھکن، دھوپ کی برچھیاں اور میں (علقمہ شبلی)

؎ چہروں کو اگر غور سے دیکھو گے تو اکثر
آنسو بھی تبسم کے نقابوں میں ملیں گے (کلیم عاجز)

؎ زندگی دی ہے مجھے آگ کے دریا کی طرح
پار جانے کے لیے موسم کی کشتی دی ہے (ظفر گورکھپوری)

؎ عمر بھر مصروف ہیں مرنے کی تیاری میں لوگ
ایک دن کے جشن کا ہوتا ہے کتنا اہتمام (خلیل الرحمٰن)

؎ شعورِ غم کے سوا کچھ نہیں ہے غم کا علاج
مگر یہ بات زمانے کو کون سمجھائے (خورشید احمد جامی)

جدید غزل میں فرقہ وارانہ فسادات، دہشت گردی کے واقعات اور اُن سے رونما ہونے والے مختلف مسائل زیادہ نمایاں اور تکراری رہے ہیں۔ ان موضوعات یا مضامین کو جدید غزل نے بڑی معروضیت، حساسیت اور دردمندی کے ساتھ پیش کیا ہے۔ جس سے جدید غزل کے پیرائے اظہار اور شعری اسلوب میں کافی تنوع ملا کیوں کہ ہر جدید شاعر نے متذکرہ موضوعات کو اپنے رویے اور نظریئے سے دیکھا اور محسوس کیا ہے۔ مثال:

؎ ساری بستی ہی مری جلا دی گئی
بے گناہی کی کیسی سزا دی گئی (راشد صدیقی)

؎ ہر مکان گھر اتھا لپکتے شعلوں میں
پگھلتی آگ کے نیچے لہو کا دریا تھا (سیف سہسرامی)

؎ جس طرف دیکھو کوئی بستی جلتی ہے
دیش میں اب کے ہوا کیسی چلی ہے (گرجا ویاس)

جدید غزل میں انسان کا مزاج صاف گوئی و بے باکی سے تشکیل پاتا ہے۔ جدید غزل گو شاعر نے اپنے تجربات کے بیان کے لیے اپنے حواس خمسہ کو رہنما بنایا ہے۔ جدید شاعر کو اپنے شخصی اور ذاتی تجربات پر یقین ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ کہیں سادگی اور کہیں بے باکی سے اپنے محسوسات کو پیش کرتا ہے۔ جدید غزل میں کہیں اعترافِ حال تو کہیں اعترافِ شکست، کہیں معاملات سے انحراف تو کہیں روایتی اخلاق کے اقرار جیسے پہلوؤں نمایاں معلوم ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جدید غزل داخلیت، مواد اور ہیئت، ذات اور کائنات غمِ جاناں اور غمِ دوراں جیسے موضوعات میں خطِ امتیاز کھینچ کر کسی ایک کو قبول اور دوسرے کو رد کرنے پر ایقان نہیں رکھتی ہے۔ جدید غزل فرد اور سماج دونوں کو ایک دوسرے کے لیے لازمہ قرار دیتی ہے۔

جدید غزل میں عورت جس کی سماجی حیثیت افراط وتفریط کی شکار تھی، بھی مردوں کے شانہ بہ شانہ مادی زندگی میں حصہ لیتی نظر آتی ہے۔ جدید غزل میں خواتین شعرا نے جبر وظلم اور زیادتی کو اپنے اظہار کا موضوع بنایا ہے۔ عورت کو اِس بات کا احساس تھا کہ وہ ہر لمحہ مرد کے سہارے کی محتاج ہے لیکن اسی احساس نے اُس کے اندر اپنے آپ ہر ہوئے ظلم و جبر کے خلاف کھڑا کر دیا۔ جس کے نتیجے میں اُس نے اُن تمام زنجیروں کا توڑ ڈالا جو اُسے مرد کی بالا دستی اور ظلم و جبر سہنے پر مجبور کرتی تھیں۔ جدید غزل نے عورت کو آزادی دی کہ وہ اپنی شناخت قائم کرنے اور مرد کے شانہ بہ شانہ کھڑا ہونے اور اپنے آپ پر لگائے گئے الزامات کا جواب دے۔ جدید غزل کی عورت آزادی اظہار رائے کو پانے کے ساتھ ہی کہہ اُٹھی:

؎ خستگی ناہید بن جائے نہ جرم
کچھ نہ ہو لیکن بھرم رکھنا بہت (کشور ناہید)

؎ پتھر کو جانتے تھے مگر پوجتے تھے
اہلِ وفا تھے اور مروت کی بات تھی (ادا جعفری)

؎ تمہیں میں دیوتاؤں کی کوئی خوبی نہ تھی ورنہ
کمی کوئی نہیں تھی میرے اندازِ پرستش میں (نوشین گیلانی)

؎ نکل کے خلد سے اُن کو ملی خلافت ارض
نکالے جانے کی تہمت ہمارے سر آئی (نسیم سید)

؎ جسم کی ساری رونق لے کے دل کی ہمت لے کے
''مالک'' جب چاہیں کہہ دیں اپنا ساماں اُٹھاؤ (نسیم سید)

جدید غزل میں اظہار کی سطح پر جو تبدیلیاں ہوئیں اُن کے پیچھے سماج اور معاشرے کا تغیر وتبدل کارفرما ہے۔ سماج میں جو تبدیلیاں سیاسی، سماجی اور تہذیبی سطح پر رونما ہوتی ہیں اُن کا اثر اردو غزل کی لفظیات پر بھی پڑتا ہے۔ نئے حالات اور نئے تخلیقی معاملات و مسائل کے تحت اُن الفاظ کے طریقۂ استعمال اور معنیاتی نظام میں بھی تبدیلیاں رونما ہوتی ہیں۔ جدید غزل میں زبان و اظہار کی سطح پر جو تبدیلیاں یا تجربات ہوئے وہ اُس سے پہلے کی غزل میں بھی ہوئے تھے۔ لیکن جدید غزل کے تجربات میں اُس دور کی حسیت اور رویے بھی شامل ہوئے۔ جدید دور کے صنعتی نظام نے زندگی میں پیچیدگیوں اور مسائل کو جنم دیا اور اُن کے اظہار کے لیے مخصوص لفظیات، استعارات وتشبیہات بھی از خود وضع کر دی۔ جدید غزل نے تغیر پذیر سماج اور معاشرے کی نئی زندگی کی وسعتوں کو ایک نئی زبان میں پیش کرنے کا ہنر سیکھا۔ جدید غزل نے زبان میں نئی توانائی، تازگی اور تاثیر پیدا کر کے جدید شاعری کے منظر نامے کو وسعت دے کر نئے ابعاد تلاش کیے۔ جدید غزل نے شعری اظہار کے لیے نئے استعارے، علامتیں اور پیکر اخذ کیے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ روایتی علامتوں اور پیکروں کی تجدید بھی کی۔ جدید غزل نے اُس دور کی تہذیبی شکست و ریخت، انسانی اقدار کی پستی، نارسائی، اُداسی، خوف اور تنہائی کا اظہار نئی تخلیقی زبان میں کیا۔ جدید غزل نے روایتی غزل کی روایتی لفظیات پر از سرِ نو غور کیا ہے۔ رسمی مضمون آفرینی، فرسودہ طرزِ بیان اور تصنع سے جدید غزل کو پاک کیا۔ اس طرح سے فطری، غیر رسمی اور انفرادی شعری اظہار کی راہیں ہموار ہوئیں۔ لیکن دوسری طرف جدید غزل کے اظہار و بیان اور تجربات بعض اوقات ایک فیشن اور تقلید معلوم ہوتے ہیں، جن کی عمر بہت کم نکلی اور اُن کے اثرات بھی دیر پا نہیں رہے۔ جدید غزل کے اس المیے پر بات کرتے ہوئے سرور الہدیٰ اپنی کتاب ''نئی اردو غزل'' میں لکھتے ہیں:

''۱۹۶۰ء کے بعد غزل گو شعراء کا ایک ایسا گروپ سامنے آیا جس نے غزل میں تراکیب، علامتوں، استعاروں اور تشبیہات کے معاملے میں

بے راہ روی برتی اور بزعم خود اُنھیں غزل کا حصہ بنا دیا۔ علامات ولفظیات کے نام پر ایک سیلاب سا آ گیا ہے اور ہر شخص اپنے طور پر علامتوں کی تخلیق کرنے لگا ہے۔ شاعری کی تمام تر کوشش اس فکر پر مرکوز ہوگئی کہ ایسا لفظ یا ایسی ترکیب وضع کی جائے جو ہر لحاظ سے نئی ہو اور جس کا کوئی رشتہ روایت سے نہ ہو۔۔۔اور ایسے عجیب وغریب قسم کے الفاظ غزل میں داخل کر رہے تھے جو نامانوس اور غزل میں بے جوڑ معلو ہوتے تھے۔''۴

اس طرح واضح ہو جاتا ہے کہ جدید غزل نے زبان کی نئی تخلیقیت کی آڑ میں جدید غزل کی زبان کو گزند بھی پہنچایا ہے۔ بول چال کی زبان اور ادبی زبان کے مابین فرق مٹانے کی کوششیں ہوئیں۔ غزل میں اُن الفاظوں کا استعمال ہونے لگا جو روزانہ ہم اپنی ضرورتوں کے مطابق استعمال کرتے ہیں۔ جدید غزل گو شعرا فیشن اور نئے تجربات کے تعاقب میں اس طرح لگے تھے کہ زبان و بیان کے اظہار میں ایک طرح کی غیر سنجیدگی نظر آنے لگی، جس کی غمازی یہ شعر کرتا ہے

؎ کیوں سر کھپا رہے ہو مضامیں کی کھوج میں
کرلو جدید شاعری لفظوں کو جوڑ کر (محمد علوی)

اسی جدید شاعری کی آڑ میں کچھ نامانوس اور غیر سنجیدہ الفاظ جیسے محسوس سے محسوسنا، تلاش سے تلاشنا، تصویر سے تصویرتا، تحریر سے تحریرتا اور زنجیر سے زنجیرتا وضع کیے گئے۔ جدید غزل کے ڈکشن میں کئی ایسی مثالیں ملیں گی جو جدید غزل پر انتہا پسندی کو ظاہر کر دیتے ہیں۔ جدید غزل میں شاعر اپنا الگ ڈکشن خلق کرنا چاہتا تھا جس کے لیے وہ تمام حدود وقوانین اور قیود کو توڑ سکتا تھا۔ چند مثالیں:

؎ چہرے پہ کیلے کے چھلکے بھی مار دیں
بلے سے پہلے اگر گیند گھوم جائے (بشیر بدر)

؎ بنا مرغے کے پر جھٹکتی ہیں
مُرغیاں در بدر بھٹکتی ہیں (محمد علوی)

؎ کچھ کہہ رہی تھی اپنی سہیلی کے کان میں
اسٹاپ کے قریب وہ لڑکی کھڑی ہوئی (حامد سروش)

؎ ہمدردیوں کی چاندنی اپنی سمیٹ لو
تم سے جو معاملہ تھا کہیں اور پٹ گیا (سید احمد شمیم)

؎ بلیاں گھات لگائے ہوئے بیٹھی ہی رہیں
جتنے چوہے تھے سبھی اُٹھے نالی نالی (اختر علیم انصاری)

جدید غزل کے اس ڈکشن نے ادب کے سنجیدہ قارئین کو کسی حد تک مایوس بھی کر دیا ہے۔ زبان وبیان کے سلسلے میں مروجہ روایتوں سے انحراف کرنے سے، شاعری میں اپنی منفرد راہ نکالنے یا اپنا الگ ڈکشن قائم کرنے سے دراصل جدید غزل کے لیے تخریب سے تعمیر کا کوئی پہلو نظر نہیں آتا ہے۔ البتہ زبان و بیان کے معاملے میں جدید غزل کے تئیں ایک حاکمانہ برتاؤ کا پتا ضرور دیتا ہے۔ جدید غزل میں زبان و بیان کے سلسلے میں اس طرح کی انتہا پسندی اپنانے کے باوجود بہت سے شعرا ایسے ہیں جن کے یہاں زبان واظہار کے معاملے میں کبھی اعتدال کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوٹا جس میں شہر یار، زیب غوری، بانی، شاذ تمکنت، منیر نیازی، ندا فاضلی، نشتر خانقاہی اور شکیب جلالی اہمیت کے حامل ہیں۔

بہر کیف جدید غزل نے جہاں ایک طرف زبان و بیان کے نئے وسائل کو جنم دیا وہیں دوسری طرف موضوعاتی اعتبار سے بھی جدید غزل نے احساس واظہار کے نئے رویے پیش کیے۔ اس احساس واظہار کو مختلف شعرا نے مختلف طریقوں سے بیان کیا

ہے۔کسی نے بے چہرگی، کسی نے اپنے وجود میں تہذیبی انسان کی جستجو، کسی نے احساسات کی بے حسی، کسی نے ہمہ گیر خوف، کسی نے زندگی کی بے معنویت، کسی نے لاسمتی اور شدید اُداسی کا وسیلہ اختیار کر کے فرد کے داخلی آئینہ خانے کے اسرار ورموز کو جاننے کی کوشش کی جس سے جدید غزل میں اظہار و بیان اور موضوعات کے اعتبار سے تنوع پیدا ہوا۔جدید غزل کی تخلیقیت میں دور جدید کے نئے تجربات کے نئے اظہار و بیان کو اپنایا گیا ہے۔پُرانی لفظیات کی بجائے جدید شعری لفظیات کو جدید غزل کے ڈکشن میں داخل کر دیا گیا۔نئی تشبیہات واستعارات معنی خیز اشارے وعلامتیں، جذبے، مناظر فطرت اور شہری زندگی سے اخذ کی ہوئی علامتی اور استعاراتی پیکر تراشی عام ہونے لگی۔جس سے جدید غزل کی لفظیات میں اضافہ ہوا۔ جدید غزل کی تخلیقیت میں انسان کے تجریدی احساسات اور جذبات کی متنوع صورتیں نظر آتی ہیں۔نئے اظہار و بیان اور نئے احساس کے لیے بھی جدید غزل نے راہیں ہموار کیں، جس پر بعض لوگوں نے ''منفی غزل''، ''اینٹی غزل'' اور ''ہزل'' کا لیبل بھی لگا دیا۔لیکن اس سے قطع نظر جدید غزل نے اردو غزل کی فضا کو وسیع اور متنوع کرنے کے لیے پرانی لفظیات، علامتوں اور تشبیہات واستعارات کو نئے طور پر برتنے کی شعوری کوششیں کیں جس سے اردو غزل نے اظہار و بیان اور نئے مضامین اور موضوعات اپنے اندر سمو کر اردو ادب کی ایک کامیاب شعری صنف کا ثبوت دیا ہے۔جدید غزل نے موضوعات اور طریقۂ اظہار میں اپنے اندر وسعت وتنوع پیدا کر کے پھر سے ثابت کر دیا ہے کہ اردو غزل وقت اور حالات کے تغیر وتبدل کے ساتھ ساتھ نئے اظہار و بیان کے طریقوں کا ساتھ دیتی ہے جو کہ ایک زندہ صنف کی پہچان ہے۔

حوالہ جات:

۱؎ ''آزادی کے بعد کی غزل کا تنقیدی مطالعہ''، بشیر بدر، انجمن ترقی اردو، ہند، نئی دہلی، ۱۹۸۱ء، ص ۲۹۸

۲؎ بحوالہ مضمون ''نئی اردو غزل کا سیاسی وسماجی مطالعہ'' از نوشاد عالم، مشمولہ سہ ماہی فکر وتحقیق، نئی دہلی، شمارہ ۱، جلد ۱۶، ۲۰۱۳ء، ص ۲۰۶

۳؎ ایضاً ص ۲۰۹

۴؎ ''نئی اردو غزل''، سرور الہدیٰ، معیار پبلی کیشنز، دہلی، ۲۰۰۴ء، ص ۱۷۱۔

قلم کاروں سے التماس

☆ برائے کرم مسودہ صاف اور خوش خط لکھیں۔

☆ مقالہ صفحے کی ایک جانب لکھا ہوا ہو۔

☆ سطروں کے درمیان فاصلہ چھوڑیں۔

☆ کمپوز کیے ہوئے مسودہ کا پروف اچھی طرح دیکھ لیں۔

☆ اپنے مضامین اور تخلیقات

"idarasabras@yahoo.in" پر بھیج سکتے ہیں۔

سب رس

ادارۂ ادبیات اردو کا رسالہ ہے۔جس کو کوئی سرکاری امداد نہیں ملتی اعزازی کاپی طلب فرما کر ہمیں شرمندہ نہ کیجیے۔

ندیم احمد انصاری

مطالعہ

'غالب: ایک باز دید' پر ایک نظر

معروف محقق، ناقد و مترجم اور گرودیو ٹیگور پروفیسر برائے تقابلی ادبیات، ممبئی یونی ورسٹی- ڈاکٹر یونس اگاسکر کے قلم کا ثمرہ یہ کتاب غالب فہمی کے موضوع پر ایک درجن فکر انگیز مضامین کا مجموعہ ہے۔ یہ تمام مضامین غالب فہمی یا غالب شناسی میں کس درجے مدد و معاون ہیں، اس کا فیصلہ تو قارئین خود کریں گے، راقم الحروف صرف اتنا عرض کرنا چاہتا ہے کہ مصنف تشکیک کی راہ سے تحقیق کرتے ہوئے جن نتائج تک پہنچے ہیں، ان سے نمایاں ہونے والی عرق ریزی و ذہنی رسائی کو داد دیے بغیر نہیں بنتی۔

یہ کتاب کیوں کر منصۂ شہور پر آئی، اس کے متعلق پروفیسر یونس اگاسکر کا بیان ہے کہ ایک عرصے قبل اُردو میں ایڈوانس ڈپلوما کا امتحان پاس کرنے والے بعض طلبہ نے اُن سے درخواست کی کہ وہ انھیں غالب پڑھائیں۔ چناں چہ شعبۂ تقابلی ادبیات کے کمرے میں ان عاشقانِ غالب کی فرمایش کی تکمیل کا سامان کیا جانے لگا، جس کا سلسلہ مصنف کی سبک دوشی کے بعد بھی یونی ورسٹی کے لیکچر کامپلیکس کے کمروں میں جاری رہا۔ ان بالغ نظر شاگردوں کی تسکینِ ذوق کے لیے، جن میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی سطح کے سند یافتہ طلبہ بھی شامل تھے، مصنف کو جو کاوش کرنی پڑی اِس نے اُن پر غالب فہمی کے کئی دَر وَا کیے اور اُنھیں ایسے جہانِ معنی کی سیر کرائی، جہاں سے لوٹ آنے کی خواہش و گنجایش ہی باقی نہ رہی۔ غالب سے مصنف کی تجدیدِ محبت اور اس کی شعری کائنات کے متنوع پہلوؤں کی باز دید کا سلسلہ اسی تفہیم و تدریسِ غالب سے شروع ہوا، جو آگے چل کر 'غالب: ایک باز دید' پر منتج ہوا ہے۔ (غالب ایک باز دید، ص: 10-9)

کتاب کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ مصنف نے غالب کے اشعار کی تشریح خود اُنھی کے اشعار سے کرنے کی سعیِ بلیغ کی ہے مگر عموماً تقدمِ زمانی کو ملحوظ رکھتے ہوئے شارحینِ سابقین کے حوالے بھی پیش کیے ہیں۔ شعری روایات بھی ان کے پیشِ نظر رہتی ہیں اور لغات سے بھی استفادہ کرتے ہیں، جس کے نتیجے میں ایسی اچھوتی بات لکھ جاتے ہیں جو دل کو چھوئے بغیر نہیں رہتی۔ یہ جدید تصنیف نہ سابقین کا ردّ ہے اور نہ مکمل مداحی۔ اس میں سابقین سے اتفاق بھی کیا گیا ہے اور اختلاف بھی۔ مگر متداول معانی میں اضافہ کرنا اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔

آگے ہم مشمولہ مضامین کا مختصر جایزہ پیش کرتے ہیں:

(۱) نظم طباطبائی کی شرح دیوانِ اردوے غالبؔ

یہ کتاب کا پہلا اور طویل ترین مضمون ہے جو دراصل پروفیسر ظفر احمد صدیقی کی مرتبہ شرح نظم طباطبائی پر مدلل و مفصل تبصرہ ہے۔ اس میں تبصرے کے اصولوں کی پابندی کرتے ہوئے جس باریک بینی کا ثبوت دیا گیا ہے، اس کی ایک مثال ملاحظہ ہو، مرتب موصوف کی جگر سوزی و دیدہ ریزی کی داد دیتے ہوئے مصنف لکھتے ہیں:

> 1900ء کی مطبوعہ 'شرح دیوانِ اردوے غالب' میں غالب کے لیے ہر جگہ مصنف کا لفظ اس کی مخفف صورت میں یعنی 'مص' استعمال ہوا ہے۔ اسے نقل نویس یا ٹاپسٹ نے مصنف لکھا یا ٹائپ کیا ہے کہ نہیں اس پر نظر رکھنا بھی

ایک مستقل مصروفیت رہی ہوگی۔(ویسے 'شرح دیوانِ اردوے غالب' میں شامل پہلی غزل کے پہلے شعر(مطلع) کی شرح کے آغاز ہی میں 'مص مرحوم' چھپا تھا جس میں سے 'مصنف' کا لفظ اس مدوّنہ ایڈیشن میں چھوٹ گیا ہے اور صرف 'مرحوم' رہ گیا ہے، لیکن اس استثنا نے مرتب کی محنت کو مزید مسلّم کردیا ہے)۔

(ایضاً،ص:16)

اس اقتباس میں مصنف نے مرتب کی دیدہ ریزی کی داد دیتے ہوئے اپنی دیدہ ریزی کا جو ثبوت فراہم کیا ہے، اس سے خود ان کی محنت مسلّم ہوگئی ہے۔جس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اصل ایڈیشن کا بھی بغور مطالعہ کیا ہے۔(ایضاً،ص:31)

زیرِ تبصرہ شرح کی خصوصیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ان الفاظ میں مرتب کی محنت کو سراہا ہے:

زیرِ مطالعہ ایڈیشن کے صفحے صفحے سے مرتب کی سخت کوشی اور حق شناسی ٹپکتی ہے۔انھوں نے اپنے کام کو اس قدر جامع و مانع بنایا ہے کہ حرف گیری کی گنجائش عموماً نہیں ملتی البتہ حواشی کے ذیل میں کہیں کہیں اشکال یا استفسار کی جا بنتی ہے جس سے مزید علمی جستجو کے لیے راہیں کھلتی ہیں۔(ایضاً،ص:16)

مرتبِ شرح پروفیسر ظفر احمد صدیقی نے کئی مقامات پر شارح سے اختلاف کیا اور ان کے تسامحات پر گرفت کی ہے، جن میں سے اکثر مقامات پر مصنف نے ان کی تائید و موافقت کر کے قارئین کے لیے مزید شہادتیں بھی فراہم کردی ہیں، جن سے انکار کی گنجایش کم سے کم تر ہوجاتی ہے۔لیکن بعض مقامات ایسے بھی ہیں جہاں انھوں نے خود مرتب کے تسامحات کی نشان دہی کی ہے۔ترتیب یہ ہے کہ پہلے مرتب کی جگر کاوی کا اعتراف کرتے ہوئے ان سے اتفاقات نقل کرتے ہیں، پھر اختلافات اور اس کے بعد تسامحات۔البتہ اندازِ سخن سنجیدہ اور پختہ ہے۔

بعض مقامات پر جہاں نظم طباطبائی مرحوم سے تسامح ہوا ہے، وہاں مصنف نے ایسی سامنے کی بات لاکر رکھ دی ہے، جس کی طرف بآسانی دھیان نہیں جاتا۔

طباطبائی کی طرف سے غالب کے درجِ ذیل شعر

جلا ہے جسم جہاں دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ، جستجو کیا ہے؟

کو بے مزہ اور مضمون کو غیر واقعی کہتے ہوئے طباطبائی نے بلاغت کی بحث اٹھاتے ہوئے لکھا تھا 'دقیقہ سنج لوگ مصنف کے اس شعر میں ضرور کہیں گے: کیا مرغی ہے جو راکھ کریدتی ہے؟' اس پر آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے مصنف تحریر فرماتے ہیں:

نہ مضمون غیر واقعی ہے اور نہ ہی لفظ 'کریدنا' بلاغت سے عاری ہے۔ ہندوؤں میں مُردوں کو جلانے کے بعد جب چِتا کی آگ ٹھنڈی ہوجاتی ہے تو استھیاں اکٹھا کر کے انھیں سپردِ آب کیا جاتا ہے۔ظاہر ہے استھیاں تلاش کرنے کے لیے (جسے پھول چننا کہا جاتا ہے) راکھ کا کریدنا ضروری ہوتا ہے۔غالبؔ نے اسی عمل کے مشاہدے کے بعد اس

انوکھے مضمون کو شعر میں باندھا ہوگا، جس کا لطف اٹھانے اور جس کی داد دینے سے طباطبائی قاصر رہے ۔(ص:25)

(۲) غالبؔ کے بعض شعروں کی باز دید

کتاب میں شامل یہ دوسرا مضمون ہے جس میں مصنف نے اپنی خلاقی ذہن کو بروے کار لاتے ہوئے غالب کے بعض شعروں کی باز دید میں ایسے عمدہ نکات پیش کیے ہیں، جن میں واقعی شرح کی ضرور محسوس ہوتی ہے ،اور عام دماغ یاری نہیں کرتا۔ایسے مقامات پر مصنف کی نکتہ سنجی سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی طبیعت میں کس درجے کا ارتکاز ہے۔اس سلسلے میں درجِ ذیل شعر میں کاغذ کا جلنا اور حروف کا ابھرنا سے متعلق جو نکتے پیش کیے ہیں وہ قابلِ داد ہیں۔شعر ملاحظہ ہو

کفِ ہر خاک بہ گردوں شدہ، قمری پرواز
دامِ ہر کاغذِ آتش زدہ، طاؤس شکار

طباطبائی نے اس شعر کی تشریح میں لکھا تھا:

کاغذِ آتش زدہ میں دو صورتیں ہوتی ہیں: ایک یہ کہ آگ سے مشبّک ہو جاتا ہے اور دام کی شکل ظاہر کرتا ہے۔دوسرے یہ کہ اس سے شعلہ بلند ہوتا ہے یعنی طاؤس کو شکار کرتا ہے۔حاصل یہ کہ فصلِ بہار نے ہر شے میں جان ڈال دی ہے کہ ہر کفِ خاک قمری بن گئی اور ہر شعلہ طاؤس بن گیا۔

اس پر استدراک کرتے ہوئے مصنف تحریر فرماتے ہیں:

دراصل شعر میں جلتے ہوئے کاغذ کی جگہ جلے ہوئے کاغذ کا مفہوم لیا جائے تو اس میں پیدا ہونے والے روشن نقطوں اور طاؤس کے پروں جیسی چمک کو طاؤس کا استعارہ سمجھنے میں کوئی اشکال نہیں رہ جاتا۔ پرانے زمانے میں لکھنے کے لیے جو روشنائی استعمال ہوتی تھی اس سے تحریر کردہ حروف کاغذ کے جلنے پر روشن اور نمایاں ہو جاتے تھے اور ان کی چمک بھی طاؤسی ہوتی تھی۔ اس اعتبار سے جلے ہوئے کاغذ کے مشبّک ہو جانے اور اس میں طاؤسی رنگ کی جھلک پیدا ہونے سے اسے دامِ طاؤس شکار کہنا، انتہائی بلیغ استعارہ ہے۔(ایضاً،ص:46)

بشمول اس مضمون کے کتاب میں متعدد مقامات پر مصنف نے طباطبائی کو اولین اور مؤقر شارحِ غالب ماننے کے ساتھ یہ جائز شکایت بھی کی ہے کہ طباطبائی کی شرح میں کہیں غیر ضروری طوالت تو کہیں بے جا اختصار پسندی نے عدم توازن پیدا کر دیا ہے۔(ایضاً،ص:49)

(۳) کھلے گا کس طرح مضموں ترے ہر شعر کا غالبؔ

کتاب میں شامل یہ تیسرا مضمون ہے، جس کے عنوان سے ہی ظاہر ہے کہ مصنف نے اس میں غالب کے بعض شعروں کی تہوں کو کھولنے کے لیے تدقیق کی ضرورت پر توجہ مبذول کرائی ہے اور چار شعروں کی تفہیم کو مختلف حوالوں سے اس طرح پیش کیا ہے کہ قاری انھیں داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا۔مصنف نے اس امر پر توجہ مرکوز رکھی ہے کہ غالبؔ کے اشعار میں کہی کے ساتھ بہت سی باتیں

اَن کہی ہوتی ہیں، اُن تک رسائی حاصل کیے بغیر کسی شعر کو سمجھنا ممکن نہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

غالب کی شعر گوئی کی ایک نمایاں خوبی یہ
ہے کہ وہ کمالِ ذہانت کے ساتھ مضمونِ
شعر کے کسی نہ کسی پہلو کو بین السطور
میں اس طرح چھپا دیتے ہیں کہ جب
تک شعر کو ایک سے زیادہ بار نہ پڑھیں یا
تدقیق سے کام نہ لیں، شعر کا مفہوم پوری
طرح نہیں کھلتا اور اسی لیے اس قسم کے
شعروں کی شرح میں بعض اوقات
ادھورے پن کا احساس ہوتا ہے
۔(ص:58)

اس پورے مضمون میں اسی امر کے شواہد پیش کیے گئے ہیں کہ کہی کے ساتھ ان کہی پر توجہ نہ دینے سے معنی کی تہ تک رسائی نہیں ہو پاتی۔

(۴) تیغ کے زخم کا طالب غالبؔ

کتاب میں شامل یہ چوتھا مضمون ہے۔ جس میں غالبؔ کے اس شعر

زخم نے داد نہ دی تنگیِ دل کی یا رب
تیر بھی سینۂ بسمل سے پریشاں نکلا

پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ اس شعر کی تشریح خود غالبؔ کے خط کے اقتباس کے حوالے سے نظم طباطبائی اور شمس الرحمٰن فاروقی پیش کر چکے تھے، لیکن انھوں نے خطوط کے بعض جملوں کو حذف کر کے معنی اخذ کیے تھے، جس سے خلطِ مبحث ہو گیا تھا۔ اسی خلطِ مبحث کو مضمونِ ہٰذا میں دفع کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اول غالبؔ کے خط سے مکمل عبارت نقل کی ہے، پھر مذکورہ شارحین کی شرح اور اخیر میں اس پر استدراک کرتے ہوئے فاروقی صاحب کا درجِ ذیل اقتباس نقل کر کے اپنی گفتگو کے لیے جواز فراہم کیا ہے:

شعر کا ہم پر یہ حق ہے کہ ہم اس کے
باریک ترین معنی تلاش کریں اور جتنے
کثیر معنی شعر میں ممکن ہوں ، ان کو
دریافت کریں۔(دیباچہ تفہیم غالب، طبع
دوم، ص:16)

(۵) پردۂ ساز کے پیچھے کیا ہے؟

کتاب میں شامل یہ پانچواں مضمون ہے۔ اس میں مصنف نے 'پردۂ ساز' کی اصطلاح کو سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس بحث کو چھیڑنے کی ضرورت بقول اُن کے اس لیے پیش آئی کہ حالی ہوں کہ طباطبائی، بیخود دہلوی ہوں کہ بیخود موہانی یا حسرت موہانی، یہ حضرات 'پردۂ ساز' کی حقیقت سے تو واقف تھے مگر شعر کی تشریح کرتے وقت اس کی معنویت کو اجاگر کرنے سے قاصر رہے، جس کے سبب بیان کی بلاغت تک ہماری رسائی نہ ہو سکی اور اس اصطلاح سے ہماری واقفیت کی کمی ان اشعار کی تہہ تک پہنچنے میں مانع ہوئی، جن میں یہ ترکیب یا اصطلاح برتی گئی ہے۔)ایضاً، ص:(81 مصنف نے اول طباطبائی، بے خود دہلوی، حسرت موہانی، آغا محمد باقر، مولانا حالی اور فاروقی صاحب کی شروحات کے علاوہ فرہنگِ آصفیہ، نوراللغات، مہذب اللغات، جامع اللغات وغیرہ کی ورق گردانی کی ہے، جس کے لیے ممبئی کے مشہور کتب خانوں؛ کریمی لائبریری اور گاندھی میموریل وغیرہ میں جا کر استفادہ کیا اور اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

تاروں کے آلاتِ موسیقی میں آڑے
لگے ہوئے پیتل کے ٹکڑوں یا آڑے
تاروں کو جن پر موسیقار اپنی انگلیاں

چلا کر مختلف راگ نکالتا ہے، پردہ کہا جاتا
ہے ۔ہارمونیم میں یہ پردہ نہیں
ہوتا۔(ایضاً،ص:80)

اس بحث میں اسد تخلص کے حامل شعروں کا حوالہ دے کر آپ نے یہ نتیجہ بھی نکالا ہے کہ نوجوان غالب کو ابتدا ہی سے مسائلِ تصوف اور رموزِ موسیقی دونوں سے واقفیت و دل چسپی تھی۔(ایضاً،ص:84)

یہاں ترتیبِ کتاب کے لحاظ سے ایک کمی یہ محسوس ہوتی ہے کہ اس بحث کا ایک ضروری حصہ اپنے مقام سے مؤخر ہوگیا ہے۔پردۂ ساز کی بحث کا مقام یہ تھا، جب کہ اگلے مضمون یعنی گلِ نغمہ کی بحث میں مندرجۂ ذیل سطریں درج کی گئی ہیں:

'پردۂ ساز' کی اصطلاح اور تاروں کے
بنے آلاتِ موسیقی مثلاً ستار 'رباب'
طنبورہ وغیرہ میں اس کی اہمیت وضرورت
پر غور کرتے ہوئے ان تاروں کی شکستگی
سے پیدا ہونے والی تیز اور دل دوز آواز
سے مصرعِ ثانی ('میں ہوں اپنی شکست
کی آواز' کی طرف اشارہ ہے) کی
توجیہہ کی جاتی تو شرح زیادہ بامعنی ہوسکتی
تھی۔فرض کیجیے پردۂ ساز سے نکلنے
والے سُروں اور راگوں سے محفل اہتزاز
میں ڈوبی ہو اور اچانک ستار یا رباب
یا چنگ کے تار جھنجھنا کے ٹوٹ جائیں، تو
محفل کی کیا کیفیت ہوگی؟ اس کیفیت کو
غالب نے 'میں ہوں اپنی شکست کی
آواز' سے درشایا ہے ۔اس میں ایک
کنایہ اور بھی ہے کہ اس آواز کی گونج کے
بعد محفل پہ سناٹا طاری ہے ۔(ایضاً،
ص:92)

اس گفتگو کے آخری جملے'اس کیفیت کو غالب نے 'میں ہوں اپنی شکست کی آواز' سے درشایا ہے۔اس میں ایک کنایہ اور بھی ہے کہ اس آواز کی گونج کے بعد محفل پہ سناٹا طاری ہے' میں ایسی معنی خیزی ہے، جسے الفاظ میں بیان نہیں کیا جاسکتا۔

(۶) گلِ نغمہ اور تفہیمِ غالب

کتاب میں شامل یہ چھٹا مضمون ہے ۔ ابتداے مضمون میں دورِ حاضر کے ماہرِ غالبیات اور درّاک شارح شمس الرحمان فاروقی صاحب کی سخت کوشی اور سخن سنجی کا اعتراف کرتے ہوئے تفہیمِ غالب میں ان کے طریقۂ کار کو بیان کیا ہے۔اس کے بعد مختلف حوالوں سے یہ ثابت کیا ہے کہ ' گلِ نغمہ' موسیقی سے متعلق ایک اصطلاح یا ترکیب ہے اور فاروقی صاحب کی تفصیلی گفتگو نقل کرنے کے بعد رقم طراز ہیں:

فاروقی صاحب نے ' پردۂ ساز' کی
ترکیب پر بھی تعمق کیا ہوتا تو 'گلِ نغمہ' کے
بھی موسیقی کی اصطلاح ہونے کے
امکان کو یکسر خارج نہ کردیتے۔غالب
نے 'گلِ نغمہ' اور 'پردۂ ساز' کو ایک ہی
مصرعے میں اس طرح برتا ہے کہ دونوں
کے اصطلاحی مفہوم کو قابلِ اعتنا سمجھے بغیر
محولہ بالا شعر کی تفہیم کا حق ادا نہیں ہوتا
۔(ایضاً،ص:89)

اس پورے مضمون میں نکتہ آفرینی اور باریک بینی کا مظاہرہ کر کے مصنف نے قاری کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے۔فاروقی

صاحب نے میر حسن کی مثنوی 'سحر البیان' میں مستعمل 'گلِ نغمہ' کی ترکیب کو درخت کے پھول اور پتیاں بتایا ہے جنھیں سمیٹنے کے لیے دشت اپنا دامن پسارتا ہے، اس پر استدراک کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> اس میں ایک اشکال یہ بھی ہے کہ نجم النسا جس درخت کے نیچے بیٹھ کر بین بجا رہی ہے ،اس درخت سے گرنے والے پھولوں اور پتیوں کو سمیٹنے کے لیے دشت کو دامن پسارنے کی کیا حاجت ہے؟ ان کے لیے تو نجم النسا کے ارد گرد کی زمین ہی کافی ہے ۔البتہ نجم النسا کی بین سے نکلنے والے جوگیا راگ کی ترنگوں پر بہنے والے گل ہائے نغمہ کے لیے جو چاروں طرف پھیل رہے ہوں ، دشت کا دامن پسارنا میر حسن کے کمالِ شعر گوئی کے عین مطابق ہے ۔(ایضاً،ص:91)

جس کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچے ہیں:

> میر حسن اور غالب دونوں نے 'گل نغمہ' کی ترکیب کو یکساں مفہوم میں استعمال کیا ہے یعنی وہ راگ جو سننے والے پر اہتزاز اور سرخوشی کا عالم طاری کردے اور ڈالی سے گرنے والے پھولوں کی طرح دل و دماغ کو شگفتگی اور تراوٹ بخشے ۔ممکن ہے یہ موسیقی کی عام فہم اصطلاح نہ ہو لیکن اس کے ایک مقررہ یا مستقل مفہوم کی حامل ترکیب ہونے میں کلام نہیں ہو سکتا ورنہ میر حسن اور غالب اسے ایک سے زیادہ بار موسیقی یا نغمہ سرائی کے سیاق میں استعمال نہ کرتے ۔(ایضاً،ص:91)

(۷) راہ زن کا استعارہ اور تفہیمِ غالب

کتاب میں شامل یہ ساتواں مضمون ہے ۔اس میں غالب کے شعر میں موجود 'راہ زن' کی مراد معلوم کرنے کی کوشش کی گئی ہے اور شارحین سابقین کی شرحوں میں تشنگی کی شکایت کے ساتھ کئی عمدہ باتیں زیرِ قلم لائی گئی ہیں ۔اول شعر ملاحظہ ہو:

بھاگے تھے ہم بہت، سو اسی کی سزا ہے یہ
ہو کر اسیر دابتے ہیں راہ زن کے پانو

اس کے ذیل میں مصنف رقم طراز ہیں:

> دراصل ہوا یہ کہ راہ زن کی زد سے بچنے کے لیے متکلم بے تحاشا بھاگا۔راہ زن نے سمجھا 'اس کے پاس بہت مال ہوگا' اس لیے اس نے بھی جان توڑ کے پیچھا کیا اور جب متکلم ہاتھ لگا تو پتا چلا کہ اس کے پاس تو مال وزر کے نام پر کچھ بھی نہیں ہے ۔متکلم نے راہ زن کو بے وجہ اتنا دوڑایا کہ اس کے پیروں میں درد ہونے لگا۔تھکن بھی ہوئی اور مال بھی ہاتھ نہیں لگا اس لیے سزا کے طور پر راہ زن نے متکلم کو بندی بنایا اور پیر دابنے کا کام اس سے لینے لگا۔(ایضاً،ص:95)

پھر اختتام کی طرف آتے ہوئے بلیغ انداز میں تحریر فرماتے ہیں:

اس شعر میں 'راہ زن' کو فلکِ کج رفتار کی جگہ اگر دنیا کا استعارہ مانیں تو یہ مفہوم نکل سکتا ہے کہ دنیا سے جتنا بھاگیں، دنیا اتنا ہی آپ کا پیچھا کرتی ہے اور ایک نہ ایک دن جب آپ اس کی گرفت میں آجاتے ہیں تو آپ کو بندی یا قیدی بنا کے اپنی خدمت کراتی ہے۔ پیر دبوانا نہایت حقیر اور ادنا قسم کی خدمت ہے۔ اس اعتبار سے اس شعر میں دنیا کی ہوس میں گرفتار ہونے والوں کی تحقیر مقصود ہے۔ (ایضاً، ص:98)

(۸) رَخشِ عمر اور تفہیمِ غالبؔ

کتاب میں شامل یہ آٹھواں اور مختصر ترین مضمون ہے۔ جس میں مصنف نے غالب کے فقط ایک شعر میں پوشیدہ معانی کی دریافت میں اپنے اشہب قلم کو رواں رکھا ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

رَو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

مصنف کے مطابق غالب نے اس شعر میں عمر بمعنی وقت کو ایک ایسے منہ زور اور برق رفتار گھوڑے سے تشبیہ دی ہے جس پر دستِ قدرت انسان کو اُس کی مرضی یا ارادے کے برخلاف سوار کر دیتا ہے۔ انسان جب اپنی مرضی سے گھوڑے پر سوار ہوگا تو پہلے رکاب میں پیر رکھ کر اوپر کو اٹھے گا، پھر زین پر جم کر بیٹھے گا اور لگام کو ہاتھ میں لے کر گھوڑے کو ایڑ لگائے گا۔ لیکن یہ اُسی صورت میں ممکن ہے جب گھوڑا زین کسے جانے کے بعد سواری کے لیے تیار ہو اور کنوتیاں اٹھائے چپ چاپ کھڑا سوار کی آمد کا منتظر ہو۔ لیکن وقت کا گھوڑا جسے غالب نے 'رخشِ عمر' کہا ہے، زین، رکاب اور لگام کے تکلفات سے قطعی عاری اور مسلسل رواں دواں رہتا ہے، وہ نہ تو کسی کے لیے رکتا ہے نہ کسی سوار کی آمد کا منتظر رہتا ہے۔ البتہ ایک غیبی قوت اُس کی برق رفتاری میں کھنڈت ڈالے بغیر انسانوں کو اس پر بٹھا دیتی ہے۔ (ایضاً، ص:99)

مصنف نے اول اس شعر کی تشریح میں فاروقی صاحب کے اقتباسات نقل کیے ہیں اور پھر ان کا ردّ کرتے ہوئے ان کے اس عمل کو بایں الفاظ شعر کی من مانی تعبیر کے مترادف قرار دیا ہے:

(غالب جیسے) شاعر کے تعلق سے یہ خیال کرنا کہ اس نے انسان کو زمان و مکان اور ماحول پر حکومت کرنے کا اہل سمجھا ہوگا، مفروضات کے تحت شعر کی من مانی تعبیر کرنے کے مترادف ہے اور شعر میں مشرقی اقوام کے زوال کی داستان کا مضمون تلاش کرنا تو نالے کو رسا باندھنے سے بھی آگے کا معاملہ معلوم ہوتا ہے۔ (ایضاً، ص:102)

(۹) خودداریِ ساحل اور تفہیمِ غالبؔ

کتاب میں شامل یہ نواں مضمون ہے، جس میں درجِ ذیل شعر کے حوالے سے خودداریِ ساحل سے غالب کی مراد کیا ہے یہ سمجھنے اور سمجھانے کی سعی کی گئی ہے۔ شعر ملاحظہ ہو:

حریفِ جوششِ دریا نہیں خودداریِ ساحل
جہاں ساقی ہو تو باطل ہے دعوا ہوشیاری کا

اس شعر کی تشریح میں مصنف فاروقی صاحب سے اختلاف درج کراتے ہوئے گویا ہیں کہ 'وہ خود اپنے وضع کردہ اصول سے انحراف کر گئے ہیں'۔ یہی سبب ہے کہ محبِ غالب ان کی بات قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں۔ چند اقتباسات/سطریں ملاحظہ ہوں:

☆ حالی کی جگہ ان کے متبعین کی گرفت کرنا اور انھیں جملوں کے لیے حالی کو شاباشی دینا نا مناسب لگتا ہے۔(ایضاً،ص:105)

☆ یہ کہتے ہوئے کہ 'تحفظ کسی شے کا ہوتا ہے اور یہ کام کوئی شخص انجام دیتا ہے' فاروقی صاحب کا 'کتوں' کی مثال دینا عجیب لگتا ہے۔(ایضاً،ص:106)

☆ غالب کے شعر سے بھی فاروقی صاحب وہ مفہوم اخذ کر رہے ہیں جو غالب کا معہودِ ذہنی نہیں ہے۔(ایضاً،ص:109)

☆ غالب کے شعر میں ساحل کو تشنہ کام مے خوار اور دریا کو ساقی سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ دریا کا ساحل کی آغوش میں سما جانے کے لیے جوش میں آنے کا تصور فاروقی صاحب کے ذہن کی اپج ہے۔ دریا تو جوش میں آتا ہی رہتا ہے۔ اس کے علاوہ 'اٹھ اٹھ کر ساحل تک پہنچنا چاہتا ہے' کیا معنی؟(ایضاً،ص:109)

☆ غالب کے زیرِ بحث شعر کی وہ تفہیم جو فاروقی صاحب نے پیش کی ہے، قابلِ قبول نہیں ہے۔(ایضاً،ص:110)

(۱۰) بلبلیں کیوں سُن کے نالوں کو غزل خواں ہو گئیں؟

کتاب میں شامل یہ دسواں مضمون ہے، جس میں غالب کے درجِ ذیل نہایت مشہور شعر کے حوالے سے گفتگو کی گئی ہے:

میں چمن میں کیا گیا گویا دبستاں کھل گیا
بلبلیں سُن کر مرے نالے غزل خواں ہو گئیں

مصنف نے اس شعر میں موجود ان کہی کو جاننے کی کوشش کی ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ شاعر کے نالے سُن کر چمن کی بلبلیں بھی غزل خوانی پر آمادہ ہو گئیں؟ اس سوال کا جواب انھوں نے اس شعر میں تلاش کیا ہے:

ہم نشیں مت کہہ کہ برہم کر نہ بزمِ عیشِ دوست
واں تو میرے نالے کو بھی اعتبارِ نغمہ ہے

اس کے ساتھ انھوں نے اول شارحین سابقین کی آرا کو قرینے سے جمع کیا ہے اور پھر یہ نتیجہ نکالا ہے:

محترم فاروقی صاحب کی تقلید میں اس شعر میں نکتہ تلاش کریں تو کہہ سکتے ہیں کہ یار کی محفلِ طرب میں اپنے نالوں کا حسرت ناک انجام دیکھ کر متکلم بلبلوں کو اپنا ہم نوا جانتے ہوئے ان کے سُر میں سُر ملا کے تسکینِ اضطراب حاصل کرنے کی خاطر چمن میں پہنچا تو وہاں بھی اس کے نالوں کا وہی انجام ہوا جو دوست کی بزمِ طرب میں ہوا تھا۔ ایسے میں وہ جائے تو کہاں جائے

۔(ایضاً،ص:115)

(۱۱) مقدمۂ حالی اور غالب شناسی

کتاب میں شامل یہ گیارہواں مضمون ہے۔اس میں اول مولانا الطاف حسین حالی کے 'مقدمۂ شعر وشاعری' میں بیان کردہ شاعر کے درجِ ذیل اوصاف پر غالب کے کھرا اترنے کو مثالوں سے ثابت کیا ہے:

☆ شاعر کے لیے اعلیٰ درجے کی قوتِ متخیلہ

☆ کائنات میں گہری نظر اور ان کے خواص و کیفیات کا مطالعہ

اس کے بعد غالب کے غزلیہ اشعار پر حالی کی تنقید پر تنقید کی ہے۔(دیکھیے،ص R) اور پھر غالبؔ کی انفرادیت کو واضح کیا ہے۔(دیکھیے،ص:124)

(۱۲) تنقیدِ حالی اور غالبؔ

کتاب میں شامل یہ بارہواں اور آخری مضمون ہے جس کے ابتدائی حصے میں حالی اور ان کی تنقید پر تنقید اور جامع تبصرہ کیا گیا ہے۔ نیز اس پر بھی زور دیا ہے کہ خواہ حالؔی خود غالبؔ سے استفادے کے منکر ہوں، لیکن ان پر شیفتہؔ و سرسید کے بہ جائے غالبؔ کے اثرات غالب ہیں۔آخر میں یہ ثابت کیا ہے کہ مقدمۂ شعر وشاعری میں حالؔی نے از خود جو اصول و معیارات مقرر کیے تھے، غالبؔ کے لیے وہ جداگانہ معیارات اپنانے کے طرف دار ہیں۔جسے انھوں نے غالبؔ کی شخصیت اور فن کا کرشمہ مانا ہے۔(دیکھیے،ص:135)

اخیر میں عرض ہے کہ اس مضمون میں چند اقتباسات کے حوالے سے ہی گفتگو کی جا سکی ہے، جب کہ کتاب اپنے موضوع پر نہایت عالمانہ و فاضلانہ اور اس بات کی متقاضی ہے کہ اس کا از اول تا آخر مطالعہ کیا جائے۔امید ہے کہ یہ غالب شناسی میں یہ ایک سنگِ میل ثابت ہوگی۔ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ پوری کتاب میں زبان و بیان کو جس اعلیٰ معیار کے ساتھ برتا گیا ہے، اس سے مصنف دورِ حاضر کے صفِ اول کے نثر نگاروں میں اپنی جگہ بنانے میں کامیاب نظر آتے ہیں۔ایک جملے میں کہنا چاہیں تو 'یہ کتاب غالب فہمی، تحقیق، تنقید، تبصرہ اور نثر نگاری کا مثالی مرقع ہے'۔

☆☆☆

شرح

دیوانِ غالب

شارح

سید محمد ضامن کنتوری

مرتبہ

اشرف رفیع

قیمت: -/1200 روپے

-/800 طلباء ایڈیشن

ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، نئی دہلی

www.ephbooks.com

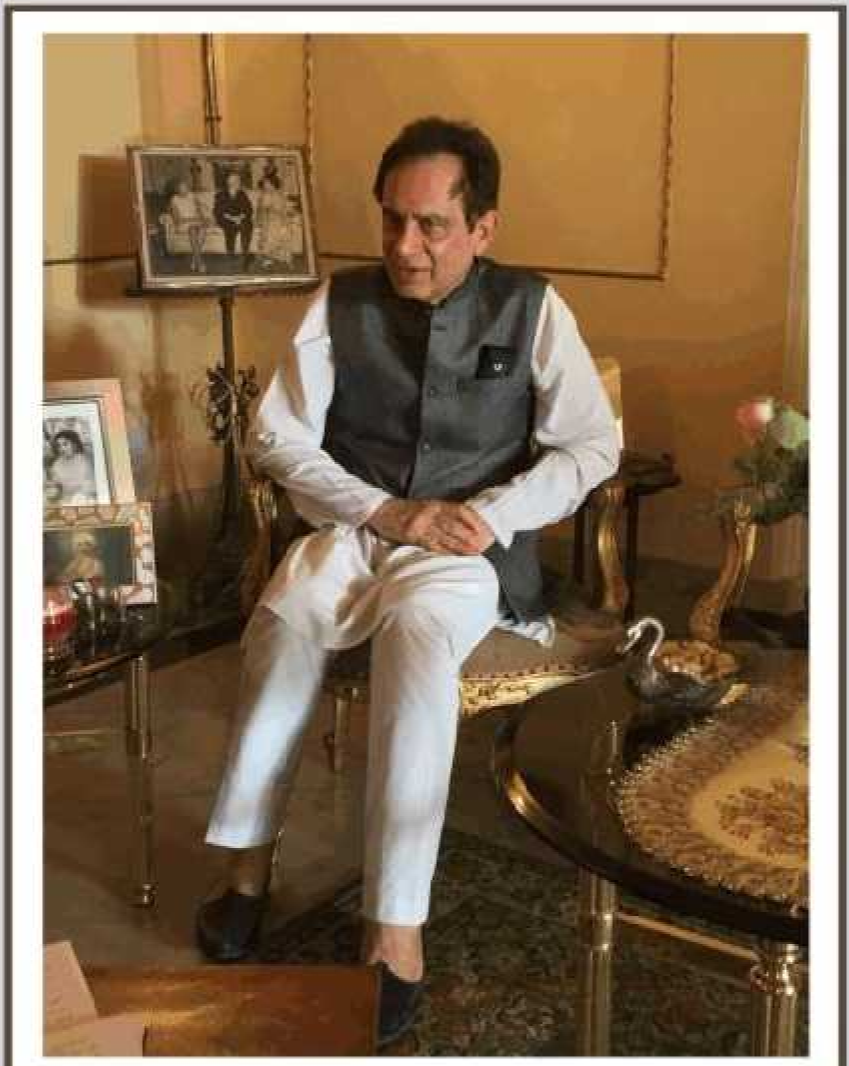

نواب میر اصغر حسین (تفصیلی مضمون ''یادیں'' صفحہ 34 پر)

Regd. No. RNP/HD/970/2018-20 RNI No. 10922-57

THE "SABRAS" URDU MONTHLY

ORGAN OF IDARA-E-ADABIYAT-E-URDU

Rs. 30/- Vol.80, Issue-08 August, 2018 Date of Publication 15th & Postal Date 20th of every month.

Printed and Published by Prof.S.A.Shukoor on behalf of Idara-e-Adabiyat-e-Urdu,
Printed at Tcahaa Print Systems, Lakdi-ka-pul, Hyderabad and Published at Idara-e-Adabiyat-e-Urdu
Aiwan-e-Urdu, Panjagutta Road, Somajiguda, Hyderabad-500 082 (T.S.) Editor : Prof. Baig Ehsas Ph : 040-23310469